تخلیقِ آدم

خوشتر نیازی

ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ وجہ تکوینِ عالم و تخلیقِ آدم کیا ہے؟ بڑے بڑے مُفکّر اور فلسفی سائنسی بُنیادوں پر یہ عقدہ وا نہ کر سکے۔ خُدا کی ذات و صفات اور اس کارخانۂ قُدرت کی بُوقلمونیوں پر جس جس نے بھی غور کیا وہ اپنے عجز کا اعتراف کر کے بیٹھ گیا۔

عقل بڑی چیز ہے مگر مجرّد عقل کے بل پر ان اُمور کا علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو فقط عقل کا چراغ دے کر ہی نہیں چھوڑ دیا، وحی کا نُور بھی بخشا ہے۔ اس نے اِنسانوں میں وہ مُقدّس ہستیاں پیدا کیں جنھیں ہم پیغمبر کہتے ہیں۔ اس نے انھیں ان تمام سوالوں کا جواب خُود عنایت فرمایا اور ان تمام معاملات کا مشاہدہ کرا دیا کہ جن کے جاننے کے لیے ہر آدمی بے چین اور بے تاب ہے۔ مگر ان کا کامل ترین اِظہار قرآنِ پاک کی وساطت سے ہوتا ہے جو نبیٔ آخر الزّماں صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہُوا۔

قرآنِ پاک کی یُوں تو ہر آیت حقیقت کے چہرے سے نقاب اُٹھاتی نظر آتی ہے مگر قصّہ آدم و ابلیس میں کمال ایجاز و فصاحت سے یہ سب اُمور زیرِ بحث آجاتے ہیں۔ مولانا کوثر نیازی نے اسی قصّے کو بحث کا مرکز قرار دینے کی کوشش کی ہے اور آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ڈارون، ویلس اور دُوسرے مغربی مفکّروں کے افکار کا اِبطال کیا ہے۔

۵۲۵۰

تخلیقِ آدم

کوثر نیازی

فیروز سنز لمیٹڈ لاہور

۵۲۵۰
۲۹۷۶۰۱۳۳۱ ۱۷

دوسری بار	1973
تعداد	1500
قیمت	6.25

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور • باہتمام عبدالحمید خان پرنٹر و پبلشر

فہرست

1	حرفِ اوّل	5
2	تکوینِ عالم	24
3	حضرتِ آدمؑ	28
	لفظ آدمؑ کی تحقیق	31
	کیا آدمؑ نبی تھے ؟	33
	امام ابنِ تیمیہ کا اِختلاف	36
	نظریۂ ارتقا اور تخلیقِ آدمؑ	37
	فرشتوں سے تذکرہ	40
	ملائکہ سے کیا مُراد ہے ؟	41
	فلاسفہ کا نقطۂ نظر	43
	غیر انبیا پر ملائکہ کا نزول	45
4	خلافتِ آدم	48
	اِنسان کو خلیفہ کیوں بنایا ؟	49
	فرشتوں کا اِستفسار	52
	عِلم الاسما	53
	سجدے کا حُکم	56
	سجدے کا حقیقی مفہُوم	57
	سجدۂ تعظیمی	58
	ایک اور نقطۂ نظر	59
	ابلیس کا اِنکار	61

	ابلیس کا مفہوم	62
	ابلیس کون تھا؟	64
	حقیقتِ جن	65
	قرآن اور جن	67
	ابلیس کو سجدے کا حکم	78
	اَنَا خَیرٌ مِنہُ	79
	عطائے مُہلت کا فلسفہ	82
	نظریۂ جبریّت	85
	نتائج و عِبَر	87
5	حضرتِ حوّا	90
	زوج کے لفظ میں حکمت	94
	مرد برتر ہے	96
6	جنّت	97
	تعیینِ شجرہ	101
	فَتَکُونَا مِنَ الظّٰلِمِینَ	103
	شیطان کی وسوسہ اندازی	107
	توریت کا بیان	109
	جنّتِ ارضی یا جنّتُ الماویٰ	111
7	عصمتِ انبیاء	117
8	توبۂ آدمؑ	128
	ہبُوطِ ارضی کا فرمان	130
9	کُتبِ حوالہ	133

حرفِ اوّل

1858ء سے پہلے تک جبکہ اُنیسویں صدی کے نصفِ آخر کے سائنس دانوں نے تخلیقِ آدم سے مُتعلق اپنا ارتقائی نظریہ پیش نہیں کیا تھا۔ دُنیا کی اکثر آبادی اپنے جدِّ امجد آدم کے بارے میں ان ہی تصوّرات کی قائل تھی جو ان کے مذاہب کے ذریعے اُن تک پہنچے تھے۔

دی ورلڈ آف دی پاسٹ کے مُرتّب ہاکس کی رُو سے بابل کے اصحابِ مذہب و دانش وہ پہلے لوگ ہیں جنھوں نے نوعِ انسان کی تخلیق پر سب سے پہلے خیال آرائی کی بنیاد رکھی تھی۔ اور یہ تصوّر عام کیا تھا کہ سب سے بڑے دیوتا آئی آ، نے انسان کی تخلیق راندۂ درگاہ دیوتا کلنگو کے خُون سے کی[1]۔ یعنی بابل کے ان دانش وروں کے نزدیک پہلا انسان اس وقت وجود میں آیا جب بڑے دیوتا آئی آ، کا عتاب کلنگو پر نازل ہُوا۔ اور کلنگو سزا کے طور پر مذبح خانے میں پہنچا اور اس کے گلے پر چھری پھری۔

اگر تہذیب و تمدّنِ بابل کے آثارِ قدیمہ کے بعض ماہرین کی رائے مان کر بابل کو دُنیا بھر کے تمدّنوں اور تہذیبوں میں اوّلیت دی جائے تو تخلیقِ آدم سے متعلق بابل کے دانش وروں کا یہ تصوّر پہلا تصوّر قرار پائے گا اور وہ مصری داستانیں ثانوی حیثیت اختیار کر لیں گی جن میں سے ایک کی رُو سے بڑے دیوتا کنوم نے انسان کی شبیہ پہلے پہل ایک کمہار کے پہیے پر بنائی تھی۔ دُوسری مصری کہانی پہلی کہانی سے خاصی مختلف ہے۔

دُوسری کہانی کے مُطابق پہلا انسان اس گائے کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا جو

---

[1] دی ورلڈ آف دی پاسٹ ص ۷، ۸۰۔

دریائے نیل کے اندر سے باہر آئی تھی۔[1]

مصری تمدّن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مسیح علیہ السّلام کی پیدائش سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے کا تمدّن ہے تو گویا آج سے سات ہزار سال قبل کے مصری اپنے جدِّ اعلیٰ کو گائے کی اولاد قرار دیتے تھے۔

مشہور ماہرِ آثارِ قدیمہ ہنٹر نے موئن جو ڈڑو اور ہڑپّہ کے سومیری تمدّن سے مُتعلق آٹھ سو مُہروں کو موضوع بنا کر جو کتاب تحریر کی ہے اس میں اس عہد کا سب سے بڑا دیوتا اس بیل کو قرار دیا ہے جو ہڑپّا اور موئن جو ڈڑو سے برآمد ہونے والی اکثر مُہروں کی پُشت پر نقش ہے۔

ہنٹر کے خیال میں موئن جو ڈڑو اور ہڑپّا کے آباد کار آریاؤں کی یلغار تک جن بُتوں یا دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے ان میں سب سے بڑا یہی بیل دیوتا تھا۔ اور یہی پہلے انسان کا خالق تھا۔ دُوسرے لفظوں میں مصری اور سومیری قریب قریب ایک ہی عقیدے کے لوگ تھے۔ مصریوں اور سومیریوں کی طرح قدیم ہندُو تہذیب میں جو رگ وید اور یجر وید کے دور کی تہذیب ہے، گائے کو گائے ماتا قرار دیا گیا ہے۔

گو رگ وید اور یجر وید سے کوئی ایسی ٹھوس شہادت تو میسّر نہیں آتی جس سے اِس مصری عقیدے کی تصدیق ہو سکے کہ پہلا انسان گائے کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا، تاہم گائے کو پہلے انسان کو دُودھ پلانے والی ماں کا لقب ضرُور دیا گیا ہے۔

یُوں رگ وید اور یجر وید کے دور کے ہندو عقائد سے بحث کرنے والے علمائے تاریخ کے نزدیک اس دور کے ہندوؤں کا سب سے بڑا دیوتا اِندر تھا اور یہ وہی تھا جسے رگ وید نے برہما کے ساتھ ساتھ پہلے انسان کی تخلیق اور پرورش کا ذمہ دار

---

[1] ایضاً حوالۂ سابق

ٹھہرایا ہے۔

دی ورلڈ آف دی پاسٹ کے مُرتّب کا بیان ہے کہ قدیم ہندُوستان کے بعض بُت پرست گروہوں کی رُو سے پہلا انسان زمین کے اندر سے شی پالپو کے اشتراح کے سبب وجُود میں آیا تھا۔[1]

اسی مصنّف کا خیال ہے کہ یُونانی فلسفی اس دنیا کے پہلے وہ دانش ور ہیں جنھوں نے پہلے پہل بُت پرست اقوامِ عالم کے نظریۂ تخلیق آدم سے مختلف نظریئے کی بنیاد رکھی تھی، خصُوصیت سے سات سو سال قبل مسیح کے دو یُونانی فلسفی انیکسی مینڈر اور آرچی لیئوس پہلے وہ فلسفی ہیں جنھوں نے بڑے واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ بنی نوع انسان کو تخلیقی ارتقا کے مرحلے سے گزرنا پڑا ہے اور پہلی انسانی نسلیں جانوروں کی شکل کی تھیں۔ اِن میں سے پہلے فلسفی کا اِدّعا یہ تھا کہ انسان پہلے پہل مچھلی کی شکل میں اس دُنیا کے تختے پر نمُودار ہُوا تھا۔

دُوسرے فلسفی آرچی لیئوس نے خیال آرائی کی کہ زمین پر برف کا بوجھ جب کم ہُوا اور اس میں حرارت پیدا ہُوئی تو زندگی چشمے کی طرح پھُوٹ پڑی اور کچھ جاندار اشیاء آپ ہی آپ وجُود میں آ گئیں۔

آرچی لیئوس کی رُو سے شروُع شروُع میں ان جاندار اشیاء میں کافی مُدّت تک باہمی جنسی اختلاف ہُوا۔ مگر بعد میں ایک مرحلہ وہ آیا کہ انسان نے باقی جانداروں سے الگ حیثیّت حاصل کر لی۔

دی ورلڈ آف دی پاسٹ کے مُصنّف کے بیان کے مُطابق ان دو یُونانی فلسفیوں کو بہُت کم مُتبّعین ملے۔ ان کے نظریے کو نہ تو یُونان ہی میں کوئی فروغ حاصل ہُوا اور

---

[1] دی ورلڈ آف دی پاسٹ ص ۷، ۸

نہ یُونان سے باہر کسی گروہ نے ان کی بات کو ذہن نشین کیا۔ اور پھر جب عیسائیت یُونان اور رُوم کے شاہی محلّات کے ذریعے عام یونانیوں اور رُومیوں کا مذہب بنی تو بائبل کے نظریۂ تخلیقِ آدم نے پچھلی ہر بات آدمی کے حافظے سے مٹادی۔

اور پھر کسی نے 1858ء سے پہلے یا زیادہ صحیح لفظوں میں 1842ء 1843ء سے قبل جبکہ چارلس ڈارون اور اس کے ہم عصر سائنس دان ویلیس نے نظریۂ ارتقائے نسلِ آدم پر سوچنا شروع نہیں کیا تھا یہ تک یاد نہ رکھا کہ یونان کے دو فلسفیوں انیکسی مینڈر اور آرچی لیئوس نے کیا گھاس کھودی تھی۔

یہ بات پُورے وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ ڈارون یا ویلیس نے 1842ء 1843ء میں جب ارتقائے نسلِ آدم کے نظریے کو قلم بند کرنا شروع کیا تھا تو کیا وہ یُونان کے سابق الذکر فلسفیوں کی سوچ سے آگاہ ہو چکے تھے تاہم چونکہ اوّل الذکر یُونانی فلسفی سابق العہد ہیں اور یہ بات ثابت ہے کہ چارلس ڈارون اور اس کا ہم عصر سائنس دان ولیس یُونانی زبان کے عالم تھے اور یونانی فلسفیوں کا مُطالعہ ان کا پسندیدہ شغل تھا اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ چارلس ڈارون اور ویلیس نے جب 1858ء میں نسلِ آدم کے جسمانی اور ذہنی ارتقاء کا نظریہ عام کیا تو انھوں نے اپنا یہ نظریہ اوّل الذکر یونانی فلسفیوں سے مُستعار لیا تھا۔

بہرحال چارلس ڈارون اور اس کے ہم عصر ویلیس نے جب یہ دعویٰ کیا کہ نئی انسانی نسل ایک بہت لمبے ارتقائی عمل کے بعد اپنی موجُودہ جسمانی ہیئت میں تبدیل ہُوئی ہے تو حالانکہ یورپ کے مذہبی حلقوں میں ایک قیامت برپا ہوگئی تھی لیکن انگلستان اور یورپ کے کئی سائنس دان اس راستے پر چل نکلے جو ڈارون اور ویلیس کے نظریئے نے ان کے سامنے کھول دیا تھا۔

اور آرتھر کیتھ تو کہتا ہے کہ سائنس دانوں کی ایک بڑی جماعت نے خُود کو اس

کام کے لیے وقف کر دیا اور یہ سلسلہ ایک سو سال گزر جانے کے باوجود اب تک جاری ہے [1]

ان سائنس دانوں نے اپنی تحقیقات کے دوران بہت سے انکشافات کیے ہیں۔ انھوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں پہنچ کر قدیم آدمی کی کھوپڑیاں، دانت اور دوسرے جسمانی اعضا برآمد کیے ہیں اور جو نتائج اخذ کیے ہیں ان کی رو سے نسلِ انسانی کو موجودہ شکل میں آنے کے لیے چار ادوار سے گزرنا پڑا ہے۔ اور یہ ادوار لاکھوں سالوں پر محیط ہیں۔

ایک انگریز مصنف کارلیٹون نے 1858ء سے لے کر 1959ء تک کے سائنس دانوں کے انکشافات کو اپنی تصنیف "دی ہسٹری آف مین" میں قلم بند کرتے وقت انسانی ارتقاء کی تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے اس کے خیال میں ان کی مجموعی عمر سات لاکھ سال ہے [2]

گویا دوسرے لفظوں میں یورپ کے کئی موجودہ سائنس دان اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسانی نسل سات لاکھ سال پہلے وجود میں آئی تھی اور پہلا انسان ان سائنس دانوں کے نزدیک سات لاکھ سال پہلے کا ہے۔

ان سات لاکھ سالوں میں انسان کے جسم اور ذہن میں ان سائنس دانوں کے خیال کے مطابق جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں وہ اِن ہڈیوں اور کھوپڑیوں کے تجزیے سے ظاہر ہوتی ہیں جو مختلف مقامات سے برآمد ہوتی ہیں اور جن کی ساخت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

---

[1] ڈسکوری آف مین ص 42-41- دی اولڈ مین آف کرومیگنس ص 181

[2] ہسٹری آف مین ص 31 نیز ص 43-

کارلیٹون نے دعویٰ کیا ہے کہ پہلے دور میں انسان کی پانچ ناپختہ یا خام نسلیں اس دُنیا میں بڑی مدّت تک آباد رہیں۔

ان نسلوں نے کچھ ہزار سال اس دُنیا کے تختے پر جینے کے بعد بولنا سیکھا اسی دوران اُنھوں نے کچھ اوزار بھی بنا لیے۔

کچھ اور ہزار سال گزرے تو یہ انسانی نسلیں کھانا پکانا بھی سیکھ گئیں۔ اور آگ کا استعمال بھی کرنے لگیں۔

اسی دور کے نصف میں "ہوموار یکٹس" کی ایک نسل نے موجودہ شکل اختیار کر لی اور جب انسانی نسل اس شکل میں تبدیل ہوئی تو خام انسان دُنیا سے ناپید ہو گئے انسان پر دُوسرا دَور جب آیا تو آدمی نے اپنے جسم کو کھالوں سے ڈھانپنے کا سلیقہ سیکھ لیا اور وہ گرم کپڑے سی کر پہننے لگا۔

اسی دور میں اس نے قدیم دُنیا کے سرد مقامات کی عمدہ اور نفیس چراگاہیں ڈھونڈ نکالیں اسی دور کے آخر میں انسان نے کمان بنائی اور اس پر تیر چڑھا کر فضا میں اُچھالنے لگا۔ یہ اس کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ اِس سے وہ جنگلی جانوروں کا شکار کھیلتا، ان کے گوشت کو آگ پر بھونتا اور اس سے اپنا پیٹ بھرتا۔

اسی دور میں اس نے کُتّے کو اپنا یار بنایا۔ وہ شکار کو جاتا تو کتّے کو اپنے ساتھ لے جاتا۔

پھر تیسرا دور شروع ہُوا۔ اِس دور میں آدمی نے کُتّے کے علاوہ کچھ اور جانوروں سے بھی دوستی شروع کی، جنگل کے کچھ اور جانوروں کا انتخاب کر کے اُنھیں سدھایا[1] اسی دَور میں اس نے اناج بویا، سبزیاں اُگائیں، مٹی کے برتن بنانے کا کام شروع کیا اور ترقی کرتے کرتے نئے اور آخری دور میں داخل ہوا۔ جو کارلیٹون کی رُو

---

[1] ہسٹری آف مین ص 31 تا 43

سے سات ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔[1]

دراصل یہی سات ہزار سال قبل مسیح کا زمانہ نئی نسلِ آدم کی عمر ہے یا زیادہ سے زیادہ جیسے کہ مؤرخ ایچ جی ویلز نے اپنی کتاب آؤٹ لائن آف ہسٹری میں دعویٰ کیا ہے کہ یہ دور بارہ ہزار قبل مسیح تک پھیلایا جا سکتا ہے۔[2]

ایچ جی ویلز ہی نہیں 1858ء سے پہلے کے تمام ماہرین آثار قدیمہ اور علماتے تاریخ کا نقطۂ نگاہ یہی تھا کہ نسلِ آدم کی عمر زیادہ سے زیادہ بارہ ہزار سال یا بعض مؤرخین کی رو سے بیس ہزار سال ہے۔

یہ سات لاکھ سال کی بات 1858ء سے پہلے نہ تو کسی سائنس دان نے کہی تھی اور نہ کسی ماہرِ آثارِ قدیمہ نے یہ گل کھلایا تھا۔ حالانکہ انسانی ہڈیوں، انسانی کھوپڑیوں اور انسانی اعضاء کے بہت سے ذخیرے ان لوگوں کو غاروں کے اندر سے بھی مل چکے تھے۔ اور زمین میں مدفون بھی پائے گئے تھے۔

1858ء کے آس پاس کے سائنس دانوں اور انگریز مصنفین اور ماہرین آثارِ قدیمہ میں سے کون ایسا ہے جسے الاہرام، بابل، نینوا، شوش، عیلام، ہڑپا موئن جو دڑو، چھوٹا ناگ پور، اور بہشتوں سے برآمد ہونے والے تمدنی آثار کا علم نہ ہو۔

1858ء سے پہلے بھی محققین کی ایک بڑی جماعت نے متعدد مقامات پر کھدائیاں کی تھیں اور انھیں تمدنی آثار از قسم ظروف اور عمارات کے ساتھ ساتھ انسانی ڈھانچے بھی میسر آئے تھے مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی نسلِ آدم کی عمر بارہ ہزار یا زیادہ سے زیادہ بیس ہزار سال سے زیادہ تشخیص نہیں کی تھی اور یہ لاکھوں سالوں کا ہیر پھیر جو 1858ء کے بعد سائنس دانوں نے شروع کیا ہے، کھوپڑیوں

---

[1] ہسٹری آف مین ص 43 [2] آؤٹ لائن آف ہسٹری ص 11، 13، 15۔

اور ہڈیوں کی شہادتوں کے باوجود کیلے فورنیا کے سائنس دان لی کو میٹی ڈونوئی کے خیال کے مطابق داہموں کے جال کے سوا اور کچھ نہیں ہے [1]

ان سائنس دانوں نے جن سائنسی اصولوں پر اپنے مفروضات کی عمارت کھڑی کی ہے وہ ان کے اپنے ذہنوں کی تخلیق ہیں۔ ورنہ جدید سائنس کو ایسی دوربینیں ابھی تک نصیب نہیں ہوئی ہیں جن کی مدد سے وہ سات لاکھ سال پیچھے کی قدیم دنیا کو دیکھ لے اور اُن دوربینوں کی مدد سے یہ کلیہ وضع کرے کہ دس لاکھ سال پہلے ابتدائی انسان پتھر کے جس دور میں چل پھر رہا تھا اس دور میں اس کی شکل بندروں ایسی تھی اور وہ گھنے جنگلوں میں اُگے ہوئے فلک بوس درختوں کے اُوپر سے زمین پر اُترا تھا۔ اور کوئی پانچ لاکھ سال مدت کے مابین زمین پر چلتے پھرتے، دوڑتے، گرتے پڑتے اس کے جسم میں یہ تبدیلی رونما ہوئی کہ پچھلی ٹانگیں لمبی ہوگئیں، ان میں اور زیادہ قوت آگئی اور اگلی ٹانگیں ہاتھ بن گئیں اور چہرے، مُہرے اور جسم کے دوسرے حصّوں کی ہڈیاں موجودہ نسل کے انسان کی ہڈیوں جیسی ہوگئیں [2]

اگر ڈارون یا اس کے ہم عصر ولیس اور ان کے بعد کے سائنس دانوں کی آنکھیں دوسرے انسانوں کی نسبت ہزاروں لاکھوں گنا زیادہ قوی ہوتیں یا ان کے پاس ایسی دوربینیں ہوتیں جو دس، پانچ لاکھ یا ایک لاکھ سال کے مابین انسانی جسم کی تبدیلیوں کا مشاہدہ کرسکتیں یا اُن بندروں پر اُٹھ جاتیں جو تیرہ ملین (ایک کروڑ تیس لاکھ) سال سے لے کر سات لاکھ قبل مسیح تک، کے وقفے میں لانبے لانبے درختوں پر سے اُتر کر زمین پر رینگتے رہے اور ان کے جسم ارتقاء کے مرحلوں میں داخل ہوئے [3] تو ایسی صورت میں تو ان کے مشاہدات کو آنکھیں بند کرکے آج

---

[1] ہیومن ڈسٹینی ص 18، 16۔ [2] ہسٹری آف مین ص 31 تا 43۔ دی ورلڈ آف دی پاسٹ۔ [3] ایضاً ہسٹری آف مین۔

کا آدمی تسلیم کرلینا۔ لیکن جبکہ حضرت ڈارون اور ان کے ہم عصر ولیس یا دُوسرے سائنسدانوں کی آنکھیں عام انسانی آنکھوں سے ماوریٰ نہ تھیں، جب کہ ان کے پاس ایسی دُوربینیں بھی نہ تھی جو لاکھوں سال پیچھے کے واقعات کا مُشاہدہ کر سکتیں تو پھر محض چند غاروں کے اندر سے برآمد ہونے والی کھوپڑیوں یا ہڈیوں سے اُنھوں نے یہ حتمی نتائج کس طرح اخذ کر لیے کہ پہلی انسانی نسل ان بندروں کی اولاد تھی جو تیرہ ملین سال سے لے کر دس لاکھ سال کے وقفے کے مابین درختوں پر سے اُتر کر زمین پر آئی اور ان کے جسم ارتقائی مراحل میں سے گزرے۔[1]

سائنس یقیناً ایک بڑا علم ہے یقیناً اس کی مدد سے نئے دور کے سائنسدانوں نے سورج، چاند اور دُوسرے ستاروں کے فاصلے ناپ لیے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اس لیے ممکن ہوا ہے کہ سورج بھی موجود ہے اور اس کے فاصلوں کو ناپنے والی دُوربینیں بھی میسّر ہیں اور وہ طاقت ور آلات بھی حاصل ہیں جو فاصلوں کے تعیّن پر قدرت رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس ڈارون، ولیس اور دُوسرے سائنسدانوں نے جس دس لاکھ، سات یا تیرہ ملین سال پہلے کے ماضی کی پیمائش کی ہے اس نے چند بوسیدہ ہڈیوں، چند جبڑوں، چند کھوپڑیوں اور چند دانتوں یا ہاتھ پاؤں کے ڈھانچوں کے سوا اور کوئی نظر آنے والا مواد ان سائنس دانوں کی خدمت میں نذر نہیں کیا ہے۔

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ 1858ء کے بعد سے لے کر 1958ء تک کے وقفے کے مابین جن سائنس دانوں نے انسان کے تخلیقی ارتقاء کے نظریے کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی تحقیق کا دامن دُنیا کے مُختلف حصّوں میں واقع

---

[1] ہسٹری آف مین ص 32، 43

غاروں، صحراؤں، دلدلوں اور کھڈوں تک پھیلایا ہے اُنھوں نے بڑی محنت کی ہے۔ سالہا سال تک وہ خردبینوں اور دُوسرے کیمیائی آلات کی مدد سے برآمدات کا معاینہ فرماتے رہے مگر اُنھوں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان میں جمع تفریق کرنے اور ضرب دینے میں غلطی کھا گئے ہیں۔ انھوں نے حال کو بُنیاد مان کر ماضی کا حساب کیا ہے اُنھوں نے حال کے باٹوں سے ماضی کی اشیاء کو تولا ہے اور وہ بھی ایسی اشیاء کو جو معدُوم ہیں موجُود نہیں ہیں۔

اگر ان سائنس دانوں کے پاس ماضی کا کوئی ایسا مواد ہوتا جو حال کے سائنسی ترازُو میں تُل سکتا تو بات اور ہوتی۔ محض چند ایسی ہڈیوں، ایسے جبڑوں اور ایسے ڈھانچوں کو حال کی دُوربینوں کی مدد سے پرکھنا جو ابہام کے پردے میں لپٹے ہُوئے ہوں اور جن کے بارے میں حتمی طور پر یہ نہ کہا جا سکتا ہو کہ یہ جس آدمی کے ہیں اس کا زمانہ کیا تھا؟ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

ارتقاء یقیناً ایک قُدرتی اصُول ہے۔ لیکن ایسا ارتقاء جو قانونِ قُدرت کے بدیہاً خلاف ہو، ارتقا نہیں ہے۔ یہ محض ذہن کا فتور ہے۔ اور اس سے ان حقائق کو بدلا نہیں جا سکتا۔ جو ہزاروں سال سے انسان کے مُشاہدے میں آ رہے ہیں۔

اگر ڈارون اور اس کے متّبعین کے نظریے میں کوئی اصُولی صداقت ہوتی اگر ان کی یہ بات حقیقت پر مبنی ہوتی کہ آدمی نے بندر کے جسم سے بتدریج ارتقائی مراحل سے گزر کر اپنی موجُودہ ہیئت اختیار کی ہے تو انسان کی معلوم تاریخ یعنی سات ہزار سال ماقبل سے لے کر آج تک کوئی ایسا واقعہ انسانی مُشاہدہ میں آیا ہوتا۔ ماضی میں ہونے والا یہ ارتقا اگر قُدرتی تھا، اگر اس میں فطرتِ صحیحہ

لہ ہسٹری آف مین ص 32، 43

کا کوئی دخل تھا، اگر یہ زمین کی حرارت اور اس پر اثر ڈالنے والے ماحول کا نتیجہ تھا تو یہ ارتقائی عمل محض ڈارون اور ویلس کے تخیّل کی سطح پر کیوں نمودار ہوا؟ اس نے سات ہزار سال پہلے کی مُسلّمہ انسانی تاریخ میں واقعے کی شکل کیوں اختیار نہیں کی ہے؟

اور انسانی تاریخ تو کہتی ہے کہ لوگوں نے ان دیکھے خُدا کو ماننے میں ہزار تامّل و تذبذب سے کام لیا ہے۔ حالانکہ خُدائی علامات ان کے چاروں طرف بکھری پڑی ہیں اور زندہ شواہد کی شکل میں موجود ہیں۔ جب انسانی ذہن کے تشکّک اور تذبذب کا یہ عالم ہے تو ڈارون اور اس کے متبعین کے مبہم اور غیر واضح مفروضات ٹھوس استشہاد کے بغیر کیسے مانے جا سکتے ہیں۔؟

یہ چند ہڈّیاں، یہ چند ڈھانچے، یہ چند جبڑے جن کا صحیح تشخُص ابھی محتاجِ تصدیق ہے سات ہزار سالہ انسانی تاریخ کے کے شواہد اور ٹھوس حقائق کو جھٹلا نہیں سکتے اور پھر جب کہ یہ مصر کے الاہرام، یہ بابل، یہ شوش، یہ نینوا، یہ موئن جو دڑو، یہ ہڑپا یہ بہشتوں، یہ عیلام کے کھنڈرات سائنس کے اپنے مُسلّمہ شواہد کی تصدیق کرنے والے شواہد ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ 1858ء کے بعد سے جن سائنس دانوں نے مختلف غاروں یا کھوؤں کے اندر سے چند جبڑے، چند ہڈیاں تلاش کر کے آدمی کو بندروں کی اولاد میں شامل کر لیا ہے اور انسانی جسم کے ارتقا کو پیشِ نظر رکھ کر دس لاکھ سال پہلے کے ماضی کی نقاب کُشائی فرما دی ہے کیا اُنھوں نے الاہرام کے شاہی مدفنوں میں دفن فراعنہ مصر اور ان کی بیگمات کی ممیاں یا حنوط شُدہ نعشیں مُلاحظہ فرمانے کی تکلیف گوارا نہیں کی؟

کیا سائنس ان حنوط شُدہ نعشوں سے انسان کے پچھلے ماضی کو پڑھنے پر قادِر

نہیں ہے اور کیا یہ نقشیں سائنس کے معیارِ استشہاد پر پوری نہیں اُترتیں ؟ اگر اُترتی ہیں تو کیا ان نقشوں میں سے کوئی نقش ایسی بھی ہے جو اس بات کی شہادت مہیّا کرے کہ انسان ماضی میں کس جسمانی ارتقا کے مرحلے میں سے گزرا ؟ کسی نقش کا جبڑا کھو پڑی، دانت یا کوئی دُوسرا عُضو کسی ذرّہ برابر جسمانی ارتقائی تبدیلی کی شہادت دیتا ہے ؟

ہم اُنیسویں صدی کے نصفِ آخر اور بیسویں صدی کے نصفِ اوّل کے کسی بھی سائنس دان کے حضور گستاخی نہیں کر رہے ہیں۔ ہم صرف یہ شکایت زبان پر لا رہے ہیں کہ اگر زمین میں مدفون یا غاروں میں سے برآمد ہونے والے مُبہم اور غیر مشخّص ڈھانچے سائنس کے نزدیک کوئی وزن رکھتے ہیں تو الاہرام کے سنگین حصاروں کے اندر ہزاروں سال سے محفوظ انسانی نقشیں کیوں قابلِ استشہاد نہیں سمجھی گئی ہیں ؟

سائنسی ابہام و تشکیک اور اُلجھاؤ کا نام تو نہیں ہے۔ سائنس تو سورج کی روشنی کی طرح چمکتی دمکتی حقیقت ہے اور یہ سائنس محض ڈارون یا ویلس کا سرمایۂ افتخار نہیں، پوری موجودہ نسلِ انسانی کا سرمایۂ جاہ و جلال ہے۔

اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت ڈارون، ویلس اور اُن کے متبعین ہی دُنیا میں ایسے تنہا سائنس دان نہیں ہیں جنھوں نے تحقیق کی جھولی کائنات کے چھپے رازوں کو اپنے اندر بھرنے کے لیے وا کی ہے۔ صرف 1858ء کے بعد کے محققین ہی کو یہ شرف تنہا حاصل نہیں ہوا ہے کہ وہ دُور اُفتادہ غاروں، دلدلوں، یا صحراؤں میں گھوم پھر کر انسانی ڈھانچوں، حیوانی ڈھانچوں اور جبڑوں کو ڈھونڈ نکالتے۔ یہ کام ان سے پہلے کے لوگ بھی کر چکے ہیں۔

کتنے ہی مسعودی، کتنے ہی ابنِ بطوطہ، کتنے ہی اصطخری، کتنے ہی ابنِ جبیل،

کتنے ہی جابر بن حیّان، کتنے ہی طبری، کتنے ہی ابنِ خلدُون، کتنے ہی الادریسی، اور البیرُونی اپنی لمبی لمبی عُمریں تحقیقِ حقائقِ ارض وسما وخلا اور تمدّنی آثار کی کھوج میں وقف کر چکے ہیں اِن میں سے اکثر نے غاروں کے اندر سے انسانی ڈھانچے بھی برآمد کیے ہیں، ہڈیاں اور جبڑے بھی مُشاہدہ میں لائے ہیں اور کسی اور چیز سے نہیں سائنس ہی کی آنکھ سے ان کا تجزیہ کیا ہے۔ مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی نسلِ آدم کے تخلیقی اِرتقاء کا وہ نظریہ پیش کرنے کی زحمت نہیں اُٹھائی ہے جو ڈارون اور اس کے متبعین نے اپنی مُبہم تحقیقات کے نتیجہ میں دُنیا کے سپُرد کیا ہے۔

یہ چاند ستاروں کی ہیئت جاننے کا شغف، یہ نباتات وحیوانات اور انسانی جسم کی مُختلف کیفیّات کا مُطالعہ، یہ زمین، خلا اور آسمان کی ہیئت اور قُدرتی اسرار کی نقاب کُشائی اور اس طرح کے دُوسرے سائنسی عُنوانات میں سے کون سا ایسا عُنوان ہے جس کو پچھلے بارہ سو سال کے مُسلمان سائنس دانوں نے اپنی تحقیق و جُستجُو کا موضُوع نہیں بنایا ہے۔ اور ہم تو یہاں تک کہنے پر قادر ہیں کہ موجُودہ سائنس نے جتنی بھی ایجادات کی ہیں، یہ ساری کی ساری بارہ سو سال کے ماضی کے مُسلمان سائنس دانوں کی جستجو و تحقیقِ پیہم کا حاصل ہے۔ سائنس کی کوئی مستقل شق ایسی نہیں ہے جس پر تحقیق کا آغاز مُسلمان سائنس دانوں نے نہ کیا ہو۔

اگر تخلیقِ آدم ابتدائی مراحل سے گزُری ہوتی اور سائنس کی بُنیادی قدریں اس کے حق ہوتیں تو کوئی نہ کوئی ابنِ خلدُون کوئی نہ کوئی مسعُودی، کوئی نہ کوئی البیرونی کوئی نہ کوئی الادریسی اُسے ضرور زیرِ بحث لاتا کہ یہ سارے کے سارے لوگ ذہنی پرواز اور تحقیق و جُستجُو میں کسی حد و حصار کے اندر محدُود نہیں رہے تھے اور ان کے ذہنِ رسا نے تخیّل کے ہر اُفق کو چھُو لیا تھا۔

اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ ڈارون اور اس کے ساتھیوں نے تو چند کھوپڑیوں، چند ڈھانچوں اور چند ہڈیوں کو مفروضی عمر دے کر اپنے معملوں میں وقتی تحقیق کا موضوع بنا لیا ہے مسلمان مؤرخین، محققین، جغرافیہ دانوں، نجومیوں، حساب دانوں، کیمیا سازوں نے تو اس کام میں اپنی عمریں کھپا دی تھیں۔

اور ان ہی پر کیا موقوف ہے تحقیقِ کائنات اور جستجوئے عالم کا سلسلہ بہت پیچھے کی سمت دراز ہے، خصوصیت سے بنی آدم نے اسی وقت ایک سائنسی علم کی حیثیت اختیار کر لی تھی جب ہیرو ڈوٹس، ایرین، کورٹیوس سٹربیو اور ڈیڈورد نامی یونانی محققینِ ارضی نے اپنی تحقیق کی بساط بچھائی تھی اور کھوپڑیوں، ڈھانچوں اور ہڈیوں کا شمار کیا ہے، انھوں نے زمین کی نبضیں اپنی انگلیوں میں بھینچ لی تھیں لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی اپنی سیاحتِ ارض کے دوران کسی کھوپڑی، کسی ڈھانچے، کسی دانت اور کسی ہڈی کو اپنا معمول ٹھہرا کر تخلیقِ نسلِ آدم کا رشتہ نہ تو لاکھوں سال پیچھے سے جوڑا اور نہ ڈارون ایسا دعویٰ ہی کیا۔

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ انسانی تاریخ کے ان پہلے کھوجیوں نے دوربینیں استعمال نہیں کی تھیں اور اپنی تحقیقاتی بینائی کی قوتیں کسی بھی نوع کی طاقتور دوربینوں کی مدد سے ہزاروں گنا بڑھائی نہ تھیں۔ اس کے باوجود ان کی تحقیق کا دامن قطعاً تہی نہ تھا۔ وہ زندہ انسانی چہروں کے مطالعے تک محدود نہیں رہے تھے انھوں نے بہت سے مدفون انسانی ڈھانچوں کی پیمائش بھی اچھی طرح کی تھی۔ اور اقوامِ عالم کے قلب میں اُتر کر ان کے ضمیر تک کو ٹٹول لیا تھا۔

بلاشبہ انھوں نے خیالی اور تصوّراتی محلات استوار کرنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی اور اپنے سامنے کی اشیا کو تولنے والے ترازوں میں ہزاروں لاکھوں سال پیچھے کے آدمی کو تولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

مثلاً ہیروڈوٹیس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ قریب کے حالات و واقعات کا تجزیہ کرتے وقت قیاس سے بھی کام لیتا تھا اور حال کے آئینے میں ماضی کا چہرہ دیکھ لینے کی کوشش سے بھی باز نہیں رہتا تھا اس کے باوجود اس نے نسلِ انسانی کے قریب کے ماضی میں جھانکنے پر قناعت کی تھی اور اپنے تخیل کی بلندی سے بہت دُور کے ماضی کو دیکھنے کا حوصلہ نہ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بعد کے محققین نے اس کو غیر واضح مزاج کا محقق قرار دیا تھا۔[1]

اور پھر یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ تاریخ ایک مستقل فن ہے۔ اس کے کچھ اپنے اُصول و ضوابط اور اپنی روایات ہیں اور جو محقق بھی تاریخ کو موضوع بناتا ہے اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس فن کے جملہ اصول و ضوابط اور روایات کی پابندی کرے۔

اس کو یہ حق قطعاً نہیں ہوتا کہ وہ محض تصوّر اور تخیل کی بنا پر کچھ مفروضات قائم کرے اور ان مفروضات کی روشنی میں کسی فرضی نسل کو آگے پیچھے دوڑاتا رہے۔

تاریخ میں تصوّر و تخیل قطعاً کارآمد نہیں ہوتا۔ تاریخ میں صرف ایسی چیزیں ہی وزن رکھتی ہیں جو ٹھوس حقائق کی شکل میں ماضی میں پیش آئی ہوں۔

آپ کو یہ حق تو حاصل ہے کہ آپ ماضی کی کسی ایسی نسل کے بارے میں اظہار خیال کریں جو واقعتاً زمین پر چلتی پھرتی آپ کے کسی معتبر راوی نے دیکھی یا جس کے بارے میں آپ کو ٹھوس شہادتیں میسّر آئی ہوں۔ ٹھوس شہادتیں خواہ آثار کی شکل میں آپ کو ملی ہوں یا روایت کی صورت میں دستیاب ہوئی ہوں آپ صرف انھی سے استشہاد کر سکتے ہیں آپ قطعاً اس بات کے مجاز نہیں ہیں کہ محض تخیل و تصوّر کی بنا پر کوئی فرضی نسل زمین پر چلائیں اور اس کی سرگذشت کو ٹھوس استشہاد کے بغیر دُنیا

---

[1] دی ورلڈ آف دی پاسٹ ص ۹

کے سامنے لے آئیں۔

ہمارے نزدیک ڈارون اور اس کے متبع سائنس دانوں کی بیان کی ہوئی سرگزشتِ بنی نوعِ انسان کے ارتقاء کی تاریخ کے اصول وضوابط پر قطعاً پوری نہیں اترتی۔

وہ مسلمہ تاریخی استشہاد کے پیشِ نظر ایک خیالی افسانے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی بنا پر 1858ء سے پہلے مرتب تاریخ کے کسی ایک واقعے کو جھٹلانے کا حوصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور خصوصیت سے وہ روداد تو کسی عنوان بھی مسخ نہیں کی جا سکتی، جو نہ صرف ارب ہا انسانوں کے نزدیک مستند مقدس الہامی کتابوں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے بلکہ جو ہماری قدیم تاریخ کا ایک گراں بہا سرمایہ ہے۔

ڈارون نے جب اپنا مخصوص نظریہ عام کیا تھا تو شاید اس نے صرف توریت و انجیل میں آدم کی تخلیق کا قصہ پڑھا تھا۔ اس نے بنی نوع انسان سے متعلق وہ تاریخی کتب دیکھنے کی تکلیف گوارا نہ کی تھی جو ہزاروں کی تعداد میں اس وقت تک چھپ چکی تھیں۔

ڈارون بالکل نہیں جانتا تھا کہ عرب مؤرخین نے جن میں ابنِ سعد، الادریسی، ابنِ سعید، الطبری، المسعودی، المدائنی، ابوالفدا، الخزائنی، ابنِ اثیر، ابنِ کثیر اور ابن خلدون پیش پیش ہیں جو تاریخِ بنی نوع انسان مرتب کی وہ اس درجہ مسلسل اور اس قدر منظم ہے کہ نسلِ آدم کی ایک ایک کڑی اور ایک ایک شاخ نقش بر حجر کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

اگر ڈارون سائنس دان ہونے کے ساتھ ساتھ مؤرخ بھی ہوتا۔ اور اس نے عرب مؤرخین کی تاریخی کتابوں کو پڑھنے کی تکلیف گوارا کی ہوتی تو اُسے معلوم ہوتا کہ عرب مؤرخین نے تو بنی نوع انسان کی داستان دہراتے وقت جو نظریہ تخلیق پیش کیا تھا وہ جسمانی ارتقاء کا نظریہ قطعاً نہیں تھا۔ وہ تو تنزل کے مدعی تھے۔ وہ تو اس بات کے قائل تھے کہ موجودہ آدمی کی قدر قامت پہلے دور کے آدمی کی نسبت بہت کم رہ گئی ہے

ان کے نزدیک تو آدم سے قریب تر چار نسلیں، جنھیں اُنھوں نے عاد ثمود قحطان و جرہم کا نام دیا ہے، قد و قامت کے لحاظ سے موجودہ دور کے آدمی سے بہت قوی تھیں۔ اِن کے قد بھی بڑے تھے اور حجم بھی۔ اُنھوں نے بڑی بڑی لمبی عمریں پائی تھیں اور ان کی یہ لمبی عمریں موجودہ دور کے آدمی سے کئی گنا زیادہ تھیں[1]

ڈارون کی طرح ان مورخین نے اپنے نظریے کی بنا محض تصور پر نہیں رکھی تھی۔ اُنھوں نے زمین کی چھاتی پر موجود ٹھوس شہادتوں سے استشہاد کیا تھا۔ انھوں نے یمن کے پہاڑوں میں بنے ہوئے ان غاروں کا مُشاہدہ خود کیا تھا جن کے دروازے بہت بڑے بڑے تھے۔ اتنے بڑے کہ ان کے اندر جانے والوں کی اُونچی قد و قامت ان میں سما سکتی تھی۔

ان عرب مورخین نے نہ صرف ان غاروں کو خود دیکھا، اُنھوں نے وہاں موجود بعض ایسے انسانی ڈھانچے بھی ملاحظہ کیے تھے جو ان کی نسل کے آدمی سے کئی گنا بڑے تھے۔

اگر ڈارون اور اس کے ساتھی اِنسانی ڈھانچوں سے استشہاد کر کے اپنا نظریہ پیش کر سکتے ہیں تو عرب مورخین المسعودی، الادریسی، اور ابن سعد کو یہ حق ملتا ہے کہ وہ اپنے مُشاہدے پر اعتماد کریں اور اس مُشاہدے کو ضبطِ تحریر میں لائیں۔

نئے دور کے محققین ارض نے یمن اور صنعا کے انسانی آثار سے اتنی دل چسپی نہیں لی ہے جتنی کہ انھوں نے دُوسرے مُقامات کے آثار سے لی ہے۔ اگر وہ یمن و صنعا کے آثار کا مشاہدہ کرتے، اور اگر انھیں عرب مورخین کی طرح گیارہ سو سال پہلے کا دقت میسّر آتا جبکہ یہ آثار اپنی صحیح ہیئت میں موجود تھے تو انھیں پہلے عرب مورخین الادریسی، ابنِ سعد اور المسعودی اور الطبری کی طرح ان آثار کو دیکھ کر

---

[1] ابوالفداص 57، 58، 59۔ مسعودی جز 2 ص 141، 142، 143۔ بحوالہ شریف الادریسی اور ابن سعد۔

یہ یقین ہو جاتا کہ عاد، ثمود، قحطان اور جرہم نام کی انسانی نسلیں اپنے قدوقامت اور قوت وطاقت کے لحاظ سے موجودہ نسلِ انسانی پر سبقت رکھتی ہیں۔

ڈارون اور اس کے ساتھی اگر یمن وصنعا نہیں جا سکتے تھے۔ وہ اگر دمشق کی جامعِ اموی یا کلیسائے یوحنّا کے بیرونی حصّے ہی کو دیکھ لینے کی توفیق پاتے تو انھیں وہاں ایسے آثار دکھائی دے جاتے جو عاد وثمود یا قحطان وجرہم میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کے حجم اس امر کی دلیل ہیں کہ ان کے صانع عام آدمی کی قوت اور طاقت سے کہیں بالا تھے۔

ہمیں اعتراف ہے کہ پہلے عرب مورّخین شریف الادریسی، ابن سعد، المسعودی اور الطبری نے آدم کی ان قریبی نسلوں عاد وثمود، قحطان وجرہم اور آدم علیہ السّلام کے مابین وقتی وزمانی فیصلے کا تعیّن نہیں کیا ہے۔ صرف اس امر کے بیان کو کافی سمجھا ہے کہ یہ انسانی نسلیں جناب نوح علیہ السّلام کے بیٹوں کی پہلی اولاد تھیں اور یہ وہ تھیں جنھوں نے زمین کی چھاتی پر پہلے انسانی تمدن کا بوجھ ڈالا تھا، جنھوں نے پہلے پہل پہاڑوں کو کھود کر ان میں گھر بنائے تھے۔[1]

اور 1858ء کے مابعد کے عرصے میں ڈارون اور اس کے متبعین کو جو انسانی بنجر میسّر آتے ہیں، وہ جن غاروں کے اندر سے انھیں ملے یہ غار ان غاروں کے بعد کے ہیں جو آدم علیہ السّلام کی قریبی نسلوں عاد وثمود، قحطان وجرہم نے کھودے تھے اور ظاہر بات ہے کہ بعد کے غاروں سے میسّر آنے والے آثار پہلے غاروں کے آثار پر کسی بھی طرح ترجیح نہیں پا سکتے اور ان کا استشہاد پہلے استشہاد سے فروتر ہے۔

یہ بات بھی عرب مورّخین کے نزدیک ثابت ہے کہ الاہرام یا مصر کے

---

[1] ابن سعد جزءِ اوّل ص ۱۹

دُوسرے تمدّنی آثار یمن اور صنعا کے بہت بعد کے ہیں۔ کیونکہ ان عرب مورخین کے نزدیک مصر کے جس بیٹے مصر کے نام پر اس ملک کا نام مصر ہوا وہ عاد و ثمود اور قحطان کے بعد کا ہے۔

بہرنوع اگر غاروں سے ملنے والے پنجر کسی نظریے کی بنا ہو سکتے ہیں تو یہ وہ پنجر ہیں جو شریف الادریسی، ابن سعد اور المسعودی کو یمن و صنعا کے غاروں میں ملے تھے کہ ان غاروں کے معماروں کا نہ صرف ہمیں علم ہے، ان کا تذکرہ تاریخ کا ایک مستقل باب ہے اور ڈارون اور ان کے متبعین کا محل ملنے والے غار بھی مشتبہ ہیں اور ان کے خالقوں کا وجود بھی قیاسی ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ عرب مورخین کو جو انسانی پنجر آج سے گیارہ سو سال پہلے ملے تھے، وہ اب کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکتے ہیں الاہرام کے فراعنہ کی نعشوں کی طرح وہ موجود نہیں ہیں۔ اس کے باوجود وہ تاریخی اسناد یقیناً پورا وزن رکھتی ہیں جن میں ان کی موجودگی ظاہر کی گئی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان تاریخی اسناد میں سے اکثر وہ ہیں جو جرمنی اور فرانس کے مورخین کے ذریعے پہلے پہل دُنیا کو معلوم ہوئی تھیں اور ان کا تاریخی مقام ساری دُنیا کے مورخین کے نزدیک حد درجہ مستند ہے۔

کوثر نیازی

اسلام آباد - 31 مارچ 1973ء

ل ابن سعد جز اوّل ص 19

تکوینِ عالم

"ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ دُنیا کا آغاز کیسے ہُوا؟ اور اس کا انجام کیا ہوگا؟"

یہ وہ سوالات ہیں جو ہر سوچنے سمجھنے والے انسان کے دِل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ہر طبیعت مُضطرب ہے کہ اس معمّے کا حل تلاش کرے اور اس قفل کی کلید اس کے ہاتھ میں آئے۔ مگر سوچنے والوں نے اس موضُوع پر جتنا کچھ سوچا، اس سے یہ مسئلہ حل تو کیا ہوتا مزید اُلجھا۔ جو بھی یہ منزل سر کرنے نکلا وہ دو گام چل کر رہ گیا اور بے اختیار پُکار اُٹھا ؎

جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی
معلوم ہُوا کہ کچھ نہ معلوم ہُوا

خُدا نے یہ کائنات کیوں پیدا کی؟ وجہِ تخلیقِ عالم کیا ہے؟ بڑے بڑے مُفکّر، فلسفی اور سائنس دان یہ عقدہ وا نہ کر سکے۔ خُدا کی ذات اور صفات اور اس کارخانۂ قدرت کی بوقلمونیوں پر جس جس نے غور کیا اس کی زبان سے یہی نکلا۔

"MAN IS FINITE, GOD IS INFINITE. HOW CAN THE FINITE COMPREHEND THE INFINITE"

(آدمی محدُود ہے، خُدا لامحدود ہے۔ محدُود، لامحدُود کا احاطہ کیوں کر کر سکتا ہے۔)

ایک سائنس دان اپنی غیر معمولی صلاحیّتِ ذہنی سے کام لے کر حیرت انگیز کارنامے

انجام دیتا ہے۔ اس کی ایجادات دنیا بھر سے اس کی دانش و بینش کا لوہا منواتی ہیں مگر جب وہ اس کائنات کے آغاز و انجام پر غور کرتا ہے تو اعتراف کر اُٹھتا ہے "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ابھی ساحلِ بحر پر بیٹھا سیپیاں چُن رہا ہوں"۔

سُقراط جیسا صاحبِ علم و فراست کہنے کو تو کہہ گیا کہ "اصل علم یہ ہے کہ آدمی اپنے بارے میں جان لے کہ میں کون ہُوں اور صداقت مُطلقہ سے میرا کیا تعلق ہے۔ دُوسرے تمام علوم اس علم کے مُقابلے میں ہیچ ہیں"۔ مگر اس امر کی وضاحت وہ بھی نہ کر سکا کہ صداقتِ مطلقہ سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ یا ہم صداقتِ مُطلقہ سے اپنا تعلق کس طرح قائم کریں۔

شاعر اپنی بلند پروازی، اعلیٰ تخیّل اور فکری عظمت کے لیے کتنے مشہور ہیں زندگی کے ایک ایک مسئلے پر انھوں نے بحث کی ہے مگر اس موڑ پہ آکر وہ بھی ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ کسی نے یہ کہہ کر اس معاملے میں اپنی عقل کے نارسا ہونے کا اعتراف کیا ؎

ماز آغاز و ز انجامِ جہاں بے خبریم
اوّل و آخر ایں کہنہ کتاب افتادست

تو کسی نے یہ کہہ کر اپنی بے علمی و بے خبری کا اعلانِ عام کیا ؎

کس ندانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

عقل بڑی چیز ہے مگر سب نے مانا کہ مجرّد عقل کے بل پر ان اُمور کا عِلم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ امام ابنِ قیمؒ نے خوب کہا کہ ترازو پہ ہر چیز کا وزن کیا جاتا ہے لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ میں اس پر پہاڑ تول لوں تو احمق کہلائے گا۔ عقل رہنما تو ضرور ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ میں اس کے ذریعے ان اُمور و

مسائل کی تہہ تک بھی پہنچ سکتا ہُوں تو یہ اس کی خام خیالی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس سلسلے میں فقط عقل کا چراغ دے کر ہی نہیں چھوڑ دیا، وحی کا نُور بھی بخشا ہے کہ جس کی روشنی میں اندھیری راتیں بھی دن کی مانند روشن نظر آتی ہیں۔ اس نے انسانوں میں سے وہ مقدّس ہستیاں پیدا کیں جنھیں ہم پیغمبر کہتے ہیں۔ انھیں ان تمام سوالوں کا جواب عنایت فرمایا اور ان تمام مُعاملات کا مُشاہدہ کرا دیا کہ جن کے جاننے کے لیے ہر آدمی بے چین اور بے تاب ہے ؎

پیمبر ہر چہ گوید دیدہ گوید

صاحبِ مِلَل ونحل نے ٹھیک کہا کہ بڑے بڑے عُقلا و حکما و فلاسفہ انبیاء و مُرسلین کے کمالات اور ان کے خوارق و معجزات کو اس طرح تکتے ہیں جس طرح بیل اور گدھے انسانوں کے عجیب و غریب افعال کو۔ اس لیے اگر فلسفی و سائنسدان کا اپنی ناقص عقل سے انبیا کے مُعجزات و کمالات کا انکار کرنا حجّت ہے تو بیل اور گدھوں کا انسانی عجائبِ قُدرت سے انکار کیوں حجّت نہیں۔؟ حقیقت یہ ہے کہ جو مقام شعُورِ انسانی کی انتہا ہے وہاں سے شعورِ پیغمبری کی ابتدا ہوتی ہے۔ انکار کرنے والے لاکھ انکار کریں۔ مگر وہ اس سلسلے میں ایک دلیل بھی پیش نہیں کر سکتے کہ پیغمبر کی اطلاعات کو غلط سمجھنے کا عینی و یقینی ذریعہ ان کے پاس کیا ہے قرآن حکیم نے منکرین کی اسی حماقت پر فرمایا۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ۔
كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الظّٰلِمِيْنَ۔ (یونس آیت ۳۸)

"نہیں یہ بات نہیں ہے اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا ہے۔ اس کے جھٹلانے

پر آمادہ ہو گئے۔ ٹھیک اس طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں تو دیکھو ظلم کرنے والوں کا کیا کچھ انجام ہو چکا ہے۔)

یعنی وہ حقائق جو ابھی علم و تجربہ میں ہی نہیں آئے اور جن کے متعلق پیغمبر کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بطور خاص اسے ان سے باخبر فرمایا ہے، ان حقائق کی تردید کے لیے آخر تمھارے پاس کون سی حتمی و فیصلہ کن دلیل موجود ہے؟

یہ حقائق و معارف اور اسرار و حکم اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے انبیاء کے ذریعے انسانیت تک پہنچانے کا اہتمام فرمایا۔ مگر انکا کامل ترین اظہار قرآن پاک کی وساطت سے ہوتا ہے جو نبی آخر الزماں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ قرآن پاک کی یوں تو ہر آیت حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتی نظر آتی ہے اور ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

کا عالم ہے مگر قصہ آدم و ابلیس میں کمالِ ایجاز و فصاحت سے یہ سب امور زیرِ بحث آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زیرِ نظر تالیف میں اسی قصے کو گفتگو کا مرکز قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

حضرت آدم علیہ السّلام

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالےٰ نے نو سُورتوں میں حضرت آدم علیہ السّلام کا ذکر فرمایا ہے۔ کہیں تفصیل سے کہیں اجمال سے اور کہیں صرف آپ کا نام ہی مذکور ہے۔ ہر جگہ قصّہ آدم سے الگ الگ موضوعات و مضامین پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ قصّہ بھی قرآن حکیم کے دُوسرے قصّوں کی طرح مُورّخانہ انداز سے ارشاد نہیں فرمایا گیا۔ نہ اس میں زمانی تقدیم و تاخیر کا لحاظ ہے نہ سن وسال کا تعیّن و تذکرہ۔ بس مضمون کی مُناسبت سے چند نتائج و عِبَر کا بیان مقصُود ہے جو کمال فصاحت و بلاغت کے ساتھ ایک قاری اور سامع کے ذہن میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود قصّہ زیرِ بحث کا ایک ایک لفظ مفاہیم و مطالب کا خزانہ ہے ایک ایک آیت میں معانی کی دُنیا آباد نظر آتی ہے اور استخراج و استنباط کی راہ سے دین کے بے شمار اصُولی اور اساسی مسائل پیشِ نظر آجاتے ہیں۔

جن نو سُورتوں میں حضرت آدم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا ذکر ہے اُن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ البقر۔ ۲ آلِ عمران۔ ۳ المائدہ۔ ۴۔ الاعراف۔ ۵۔ الاسراء۔ ۶ الکہف ۷ مریم۔ ۸ طٰہٰ۔ ۹۔ یٰسٓ۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا

تَعْلَمُوْنَ ۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى
الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ
الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۔ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ
بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۔ وَاِذْ
قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۖ
وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ
وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا
مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪
وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ
وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ
هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۔ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ
مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔

(سورۃ البقرۃ)

(اور وہ وقت یاد کر جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں
زمین پر اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں۔ وہ بولے کیا تو اس میں ایسے کو
بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا درآں حالیکہ
ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں
(اللہ نے) فرمایا۔ یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اللہ نے آدم

کو نام سکھلا دیے۔ کُل کے کُل پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا پھر فرمایا بتاؤ تو ان کے نام اگر تم سچے ہو۔ وہ بولے تو پاک ذات ہے ہمیں تو کوئی علم نہیں۔ مگر ہاں وہی جو تُو نے ہمیں علم دے دیا بیشک تو ہی ہے بڑا علم والا حکمت والا۔ (اللہ نے فرمایا) اے آدم بتلا دو انھیں ان کے نام پھر جب انھوں نے انھیں ان کے نام بتلا دیے تو فرمایا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمان اور زمین کی چھپی ہُوئی چیزیں جانتا ہُوں اور جو کہ تُم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھُپاتے ہو وہ سب جانتا ہُوں۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے سامنے "سجدہ" کرو تو ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور تکبّر میں آگیا اور کافروں سے ہو گیا۔ اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمھاری بیوی بہشت میں رہو سہو اور اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم گناہگاروں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے دونوں کو پھسلایا اس درخت کے باعث اور جس میں تھے اس سے اُنھیں نکلوا دیا اور ہم نے کہا تم سب نیچے اُتر جاؤ ایک دُوسرے کے دُشمن ہو کر۔ اور تمھارے لیے زمین ہی پر ٹھکانا اور ایک میعاد تک نفع اُٹھانا ہے۔ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ الفاظ سیکھ لیے۔ پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی وہ تو ہے ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان اور ہم نے حکم دیا کہ تم سب اس سے نیچے اُتر جاؤ۔ پھر اگر تمھیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا سو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہی ہوں گے اور جو لوگ کُفر کریں

گے اور ہماری آیتوں کو جُھٹلائیں گے۔ سو وہی دوزخی ہیں اور وہ
اس میں ہمیشہ پڑے رہیں گے۔)

لفظِ آدم کی تحقیق

یہ بات مختلف فیہ ہے کہ آدم عجمی زبان کا لفظ ہے یا عربی کا۔ صاحبِ تفسیر کشاف زمخشری کے نزدیک یہ عجمی زبان کا لفظ ہے اور جس طرح قرآن میں آزر کا لفظ آیا ہے اسی طرح یہ بھی فاعَل کے وزن پر ہے۔ ابُو اسحٰق ثعلبی کہتے ہیں کہ عبرانی زبان میں آدم خاک کو کہتے ہیں اور چُونکہ ابُوالبشر خاک سے پیدا کیے گئے اس لیے وہ آدم کہلائے۔ مگر بیشتر علماء و مُفسرین کی رائے میں یہ عربی نام ہے۔ ان کے نزدیک آدم چونکہ ادیمُ الارض (زمین کی جِلد) سے پیدا ہُوئے، اس لیے انہیں آدم کہا جاتا ہے۔ ابن جریر نے ابُو موسیٰ اشعری کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

ان اللہ خلق اٰدم من قبضة قبضھا من جمیع الارض، فجاء بنو اٰدم علی قدر الارض جاء منھم الاحمر والاسود والابیض وبین ذٰلک

(اللہ تعالےٰ نے پُوری زمین سے مٹی کی ایک مُٹھی لے کر حضرت آدم کو پیدا فرمایا۔ اسی لیے بنی آدم سُرخ، سیاہ اور سفید مُختلف رنگ رُوپ کے ساتھ پیدا ہُوتے۔)

ابن جریر نے اسی مضمُون کا ایک قول حضرت ابنِ عباس رضؓ کا بھی نقل کیا ہے۔

ومن ثم سمی اٰدم، لانہ خلق من ادیم الارض

لہ ابن جریر ج ۱ ص 480

(چوں کہ وہ زمین کی جلد سے پیدا کیے گئے اس لیے آدم کہلائے۔)

بعض نے کہا کہ وہ اپنی سُرخ رنگت کی بنا پر آدم کے نام سے موسُوم ہُوئے وَقِيلَ بسمرة فی لونه (امام راغب) آئمہ تفسیر میں سے حضرت مجاہد تابعی نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کی کہ ان کے نزدیک آدم اُدمتہ سے مشتق ہے جس کے معنی گندم گوں ہونے کے ہیں۔ بعض علمائے لغت کے نزدیک افعل کے وزن پر آدمؑ کا اشتقاق اُدمتہؐ سے ہے جس کا مطلب ہے لائقِ اتباع وتقلید۔

لفظ آدم کی لغوی ولسانی تحقیق میں یہ سب بحثیں مفسّرین کے ہاں ہوا کی ہیں مگر موجودہ زمانہ کے بعض روشن دماغ مفکّرین کی طرح یہ کسی نے بھی نہیں کہا کہ آدمؑ سے مُراد کوئی مُعیّن شخصیّت نہیں بلکہ یہ کنایہ ہے پُوری انسانیت سے اوراس سے پُوری نسلِ انسانی مراد ہے۔ حیرت ہے کہ جولوگ اس طرح کی بے بنیاد تاویلیں کرتے ہیں وہ قرآن کی اس آیت پر غور کرنے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں فرماتے جس میں صریحاً آدم کو ایک متعیّن شخصیت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝

(عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے۔ اللہ نے اسے مٹّی سے پیدا فرمایا۔ پھر اس سے فرمایا ہو جا تو وہ ہو گیا۔)

اس آیت میں اگر مفکّرین جدید کے بقول آدم کا لفظ بمعنی نسلِ انسانی استعمال ہوا ہے تو بات یوں ہو گی کہ عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک نسلِ انسانی کی سی ہے۔ مگر ذرا بھی غور کیا جائے تو آیت کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ یہاں مقصود نصاریٰ کے عقیدۂ تثلیث وابنیت کی تردید ہے۔ فرمایا یہ جا رہا ہے کہ عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا ہُوئے دیکھ کر تم ان کو خدا نہ سمجھ بیٹھو، ہم تو ان سے پہلے آدم کو بغیر ماں باپ کے پیدا کر

چکے ہیں۔ اور اس کے باوجود ان کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ وہ ہمارے "عبدِ خاص" ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىٓ اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔

(بے شک اللہ نے چُن لیا آدم، نُوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو جہان والوں پر۔)

ایک اور مقام پر فرمایا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ

(یہ وہ ہیں جن پر انبیاء میں سے اولادِ آدم میں سے اللہ نے انعام فرمایا)

کیا آدمؑ نبی تھے؟

"قصہ آدم و ابلیس" میں حضرت آدمؑ کے جنّت سے نکلنے پر بعض لوگوں نے یہ شُبہہ ظاہر کیا ہے کہ حضرت آدمؑ نبی نہیں تھے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ بظاہر نظر اُن سے جو خطا سرزد ہوئی وہ کسی نبی کے شایانِ شان نہیں ہے۔ ہم اس خطا کی حقیقت پر انشاء اللہ موقع و مناسبت کے لحاظ سے تفصیلی بحث کریں گے۔ یہاں اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن و حدیث کی مُتعدد صراحتوں سے حضرتِ آدم کی نبوّت بلکہ رسالت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ نبوّت پر رسالت کا اضافہ ہم نے اس لیے کیا کہ نبوّت تو مقامِ وحی پر فائز ہونے کا نام ہے۔ لیکن رسُول وہ ہے جو صاحبِ شریعت بھی ہو۔ جہاں تک حضرتِ آدم پر نزولِ وحی کا تعلق ہے سُورۃ بقر کی انھی آیتوں سے اس کا اثبات ہو رہا ہے جو ہم نے اُوپر درج کی ہیں بلکہ دیکھا جائے تو حضرت

آدم کا صاحبِ شریعت ہونا بھی انھی سے ظاہر ہے۔ شریعت کی اصل و اساس کیا ہے؟ امر و نہی۔ اور ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین پر اُتارا تو ارشاد ہوا۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

(اور ہم نے کہا تم سب اس سے نیچے اُتر جاؤ۔ پھر اگر تمھیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔ اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔)

دیکھا جائے تو یہ ایک آیت سبھی اوامر پر محیط ہے "تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا" اب رہے نواہی تو اسی آیت کے دُوسرے جزو میں ان کا بیان موجود ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔

(اور جو لوگ کفر کریں اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے سو وہی دوزخی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ پڑے رہیں گے۔)

صاحبُ البدایہ والنہایہ نے محمد ابنِ حبان کے حوالے سے حضرت ابوذر غفاریؓ کی یہ روایت نقل کی ہے۔

قال قلت یا رسول اللہ کم الانبیاء قال مائۃ الف واربعۃ و عشرون الفا۔ قلت یا رسول اللہ کم الرسل منھم قال ثلاثمائۃ و ثلاثۃ عشر جم غفیر۔ قلت یا رسول اللہ من کان اولھم۔ قال ادم قلت یا رسول اللہ نبی مرسل قال نعم خلقہ اللہ بیدہٖ نفخ فیہ من روحہ ثم سواہ قبلا[1]

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۹۷

(میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے انبیاء کی تعداد دریافت کی تو حضور نے فرمایا کہ وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں۔ پھر سوال کیا اُن میں رسول کتنے ہیں تو آپ نے جواب دیا تین سو تیرہ کی بڑی تعداد میں نے پوچھا یا رسولؐ اللہ! اِن میں سے اوّل کون ہیں۔ ارشاد ہوا آدم میں نے عرض کیا وہ نبی مُرسل تھے؟ فرمایا ہاں۔ اللہ نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا۔ پھر ان میں رُوح پھونکی اور اپنے سامنے ان کو درست کیا)

ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابو ذرؓ کی یہ روایت بھی نقل کی ہے۔

عن ابی ذرؓ قال قلت یا رسول اللہ رایت ادم انبیاء کان قال نعم نبیا رسولا یکلم اللہ قبیلا۔[1]

(حضرت ابُو ذر غفّاری سے روایت ہے کہ اُنھوں نے کہا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ، ارشاد فرمایئے کیا آدم نبی تھے۔ حضورؐ نے فرمایا ہاں وہ نبی تھے اور رسُول بھی۔ انھیں اللہ تعالےٰ سے شرفِ ہمکلامی حاصل ہے۔)

ایک اور روایت میں ہے۔

سمعت ابا امامۃ ان رجلا قال یا رسول اللہ ابنی کان آدم قال نعم مکلمؐ۔[2]

(راوی کہتا ہے میں نے ابو امامہ سے خود سُنا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ سے دریافت کیا۔ یا رسُولؐ اللہ! کیا آدمؑ نبی تھے، آپؐ نے فرمایا ہاں نبی تھے اور ایسے نبی جو اللہ سے ہم کلام ہوئے۔)

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص 34

[2] البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص 102

امام ابنِ تیمیہ کا اختلاف

اس مقام پر امام ابن تیمیہؒ کی تحقیق بھی قابلِ ذکر ہے۔ اُنھوں نے اپنی مشہور کتاب النبوات میں تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ نبی اور رسُول میں کیا فرق ہے؟ اور سب سے پہلے رسُول کون تھے؟ امام صاحب کے نزدیک نبی کا مطلب اس ہستی سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے غیب کی خبریں دی ہوں قطع نظر اس کے کہ وہ ان کو لوگوں تک پہنچائے یا نہ پہنچائے۔ الذی نبأہ اللہ۔ جب تک کوئی نبی خدا کی طرف سے غیب کی خبروں کو خود زیرِ عمل لاتا رہتا ہے اور دُوسروں کو یہ اطلاعات پہنچانے کا منجانب اللہ مکلّف نہیں ہوتا، وہ نبی کہلاتا ہے اس صُورت میں وہ کسی پہلی شریعت پر بھی عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے حُکم سے وہ ان خبروں کو کسی کافر قوم تک پہنچانے پر مامُور ہو جائے تو نبی ہونے کے ساتھ ساتھ منصبِ رسالت پر بھی فائز ہو جاتا ہے۔ اس بحث کے بعد امام صاحب نے یہ بتایا ہے کہ حضرت آدم سے لے کر حضرت نوُح تک کے دور میں جتنے انبیاء آئے ہیں وہ فقط نبی تھے رسُول نہیں تھے۔ اس سارے زمانے میں انبیاء کا کام صرف یہ تھا کہ وہ وحی الٰہی پر خود چلیں اور مومنین کے جو گروہ دنیا میں آباد تھے انھیں بھی اس پر عمل کرنے کا حُکم دیں۔ حضرت نوُح علیہ السّلام کے وقت میں آکر کُفر کو جماؤ نصیب ہُوا جس کی بیخ کنی کے لیے حضرت نوُح علیہ السّلام کو بھیجا گیا۔ اسی لیے وہ دُنیا میں اللہ کے سب سے پہلے رسُول ہیں۔

بہر حال یہ تو ایک ضمنی بحث تھی بتانا یہ مقصُود تھا کہ سلف میں حضرت آدم علیہ السّلام کی نبوّت کا مسئلہ کبھی بھی مختلف فیہ نہیں رہا۔ آج اگر مسئلہ کو اختلافی بنانے کی کوشش کی جارہی ہے تو اسے کم علمی اور کم نظری کے سِوا اور کیا کہا جائے؟

عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ "ذوالکفل" دراصل گوتم بدھ تھے اور کرشن مہاراج بھی انبیاء میں شامل ہیں اور اس سلسلہ میں کسی کے پاس کوئی نصِ قرآنی موجود نہیں ہے فقط اندازے ہی اندازے ہیں۔ مگر دوسری طرف قرآن و حدیث نے صراحت کے ساتھ آدم علیہ السلام کا تذکرہ انبیاء و رسل کے ساتھ کیا ہے اور اس میں سو طرح کے شکوک و شبہات پیش کیے جا رہے ہیں۔

نظریۂ ارتقاء اور تخلیقِ آدمؑ

قرآن نے انسانِ اوّل کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات وضاحت سے بیان کی ہے کہ اس کا سینہ نورِ توحید سے منوّر تھا۔ ایسا نہیں کہ وہ جہالت اور جاہلیت کے عالم میں پیدا ہوا ہو۔ اور ایک عرصۂ دراز کے بعد اس کی اولاد مسلسل تجربات و مشاہدات کے ذریعے خدا اور مذہب کے موجودہ تصوّرات تک پہنچے ہیں کامیاب ہوئی ہو۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ انسانیت کا آغاز ہی ہدایت و ایمان کی روشنی میں ہوا۔ قرآن کہتا ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۔ (پارہ ۲۔ آیت ۲۱۳)

(لوگ ایک ہی اُمّت تھے پھر اللہ نے انبیاء بھیجے خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے اور اُن کے ساتھ کتبِ حق نازل کیں تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اس بات میں فیصلہ کریں جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے۔)

یعنی شروع شروع میں ایسا نہیں تھا کہ لوگ شرک میں مبتلا ہوں۔ وہ تو ملّتِ

واحدہ تھے۔ یہ اختلافات اور تفرقے جو رُونما ہُوئے تو یہ بعد کو ہُوئے اور انھی کو رفع کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر نازل کیے آج سے کچھ عرصہ پیشتر بعض یورپین فاضل یہی سمجھتے تھے کہ مذہب کی ابتدا، دیوی دیوتاؤں اور دُوسرے موہُوم عقائد سے ہُوئی۔ مگر حالیہ عصری تحقیقات کے بعد اب وہ بھی ماننے لگے ہیں کہ آغازِ حیات میں نسلِ انسانی کا مذہب توحید تھا۔ ایک مشہور انگریز فاضل سر چارلس ہارسٹن BIBLE IS TRUE میں لکھتے ہیں۔

THE ORIGINAL RELIGION OF THE EARLY RACES WAS ACTUALLY MONOTHEISM OR SOMETHING VERY LIKE IT.

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

THE THEORY OF THE EVOLUTION OF RELIGION IS CONTRADICTED BY THE EVIDENCE OF BOTH ARCHAEOLOGY AND ANTHROPOLOGY.

(آثارِ قدیمہ اور علم الانسانیت ہر دو کے ذریعے مذہبی ارتقاء کے نظریہ کی تردید ہوتی ہے۔)

لنگڈن لکھتے ہیں۔

IN MY OPINION THE HISTORY OF THE OLDEST RELIGION OF MAN IS A RAPID DECLINE FROM MONOTHEISM TO EXTREME POLYTHEISM.

(میرے نزدیک انسان کے قدیم ترین مذہب کی تاریخ توحید سے تعدد الٰہ کی طرف تیزی سے تنزل کا نام ہے۔)

اس کے ساتھ ساتھ تخلیقِ آدم کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارتقائے حیات کے اس تصوّر کی جڑ کاٹ دی ہے جس کے مؤسّسِ اوّل حضرت ڈارون ہیں۔ قرآن مجید نے صاف صاف بتایا ہے کہ حیاتِ انسانی نفخِ رُوح سے ظہور میں آئی ہے اور رُوح ایک غیبی طاقت ہے۔ جس کی کنہ تک ہم نہیں پہونچ سکتے۔ جب رُوح جسدِ انسانی سے خارج ہو جاتی ہے تو اُسے موت کہتے ہیں۔ فرمایا۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۔ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۔ (حجر ۲۱)

(تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا، میں خمیر اٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں تو جب ایسا ہو کہ میں اُسے درست کر دوں اور اس میں اپنی رُوح پھونک دوں تو چاہیئے کہ تم سب اس کے آگے سربسجود ہو جاؤ۔)

بدقسمتی سے بعض اہلِ علم میں یہ رجحان بہت قوّت پکڑ گیا ہے کہ وہ قرآن کی ہر آیت کو وقت کے مسلّمات و نظریات کے مطابق ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ چند سال کے بعد خود ان نظریات پر کیا بیتے گی اور ان میں کیا کیا ترامیم وارد ہوں گی۔ حیرت ہے کہ اپنی تفسیر کے بعض مقامات پر مفتی محمد عبدہٗ جیسے بالغ النظر عالم بھی اس رُجحانِ عام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ وہ اسی تخلیقی ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ کے ذیل میں لکھتے ہیں

فالسلالة المستخرجة من الطين هي المكون الاوّل الذي يعبرون عنه بلسان العلم الآن "بالذر تو بلاسماء"

پس مٹی سے نکالا ہوا خلاصہ وہی مکونِ اوّل ہے جسے آج کی علمی زبان میں

بزرتو بلاسما" کہا جاتا ہے۔"

واضح رہے کہ یہ بزرتو بلاسما انگریزی کے "پروٹوپلازم" کا مُعرّب ہے۔ جو حیات کا خالص مادہ پرستانہ تصوّر ہے۔ اس کی رُو سے انسانی موت وحیات، نباتات کی موت وحیات کی مانند ہے اور خُدا کا جو تمام حوادث کی علّت العلل ہے انسان کی زندگی اور موت سے کوئی واسطہ سرے سے ہے ہی نہیں۔

قرآن بھی تاریخ کے عملِ ارتقاء کا قائل ہے مگر اس کے نزدیک یہ ارتقاء فطرتِ انسانی کے بنیادی مُطالبات اور ضرُوریات میں نہیں ذرائع و وسائل میں ہے۔ مثال کے طور پر کھانے پینے اور رہنے سہنے کی ضرورت ایک بُنیادی ضرورت ہے۔ انسانیت اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ البتّہ ان کے برتنے اور استعمال کرنے کے ذرائع و وسائل میں وہ ضرُورت نئی راہیں نکال رہی ہے۔ ہم قصۂ آدم و ابلیس ہی میں دیکھتے ہیں کہ مُعاشرت کے اعتبار سے انسانِ اوّل کی حالت یہ تھی کہ اُسے اپنی برہنگی چھُپانے کے لیے پتّوں کا سہارا لینا پڑا۔ لیکن جہاں تک فعلِ تخلیق یا مذہب و مسلک کا تعلق ہے اس میں کسی عملِ ارتقاء کا کوئی سُراغ نہیں ملتا۔ ابُوالبشر حضرت آدمؑ بہترین خلقت پر پیدا ہُوئے اور دُنیا میں بہترین عقیدہ، عقیدۂ توحید پر اُن کی بعثت ہوئی۔

فرشتوں سے تذکرہ

اللہ تعالیٰ نے انسانِ اوّل کی پیدائش کا قصد فرمایا تو نصِ قرآنی کی رُو سے اس نے فرشتوں سے اس کا تذکرہ فرمایا اور بتایا کہ مَیں زمین میں اپنا خلیفہ مُقرّر کرنے کا ارادہ رکھتا ہُوں۔ یہ ذکر کس لیے کیا؟ ظاہر ہے بر سبیلِ مشورہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ وہ اپنے افعال میں مخلوق کے مشوروں کی ضرُورت محسُوس کرے۔ یہ سوال اور بھی اہم بن جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ زمین، آسمان، پہاڑ

بحر و بر اور بے شمار دُوسری مخلوقات پیدا کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے بطور خاص اپنے پیشگی ارادہ کا اظہار نہیں کیا۔ محققین کے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ فرشتوں سے اس ارادہ کا ذکر کرنے سے مقصود حضرتِ انسان کے شرف و فضیلت کا اظہار تھا۔ گویا بتایا یہ جا رہا تھا کہ ؎

آمد آں یارے کہ مامی خواستیم

مشہور مفسر ابن حیانؒ اندلسی نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں بعینہٖ یہی مفہوم مُراد لیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

ولم یقل انی خالقٌ عرشاً اوجنةً او ملکاً وان قال ذٰلک تشریفًا و تخصیصًا لاٰدم

مگر ہمارے نزدیک اس سوال سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ خُود ملائکہ سے کیا مُراد ہے؟

ملائکہ سے کیا مُراد ہے؟

اکثر علمائے لُغت کا خیال یہ ہے کہ یہ ملاک کی جمع ہے جو "الوکتہ" سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے پیام رسانی۔ ابنِ جریر نے اس مفہوم کی تائید میں عربی شاعری سے مُتعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ عدی بن زید العبادی کا شعر ہے۔

ابلغ النعمان عنّی ملاکًا   اِنّهٗ قد طال حبسی وانتظاری

(نعمان کو میری طرف سے قاصد بھیج دو کہ میری قید اور انتظار کی مُدت طُول پکڑ گئی۔)

قاضی بیضاوی نے اس مفہوم کی تائید کے علاوہ یہ بھی کہا کہ اس لفظ کا ماخذ "ملاک" ہے جس کے معنی ہیں دارومدار۔ چُونکہ اللہ تعالیٰ اپنا نظامِ کائنات فرشتوں

کے ذریعے چلا رہا ہے اور یہ خالق و مخلوق کے درمیان بمنزلہ واسطہ کے ہیں اس لیے انھیں ملائکہ کہا جاتا ہے۔

والملائکۃ جمع ملاک وھو مقلوب مالک من الوکۃ وھی الرسالۃ لانھم وسائط بین اللہ وبین الناس فھم رسل اللہ او کالرسل علیھم [1]

امام راغبؒ اصفہانی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "المفردات" میں ملک اور ملائکہ کے درمیان یہ تخصیص بیان کی ہے کہ ملائکہ کا لفظ تو عام فرشتوں کے لیے ہے لیکن "ملک" خاص وہ فرشتے ہیں جن سے نظمِ کائنات کے بعض امور متعلق ہیں ان کے نزدیک انھی مؤخرالذکر فرشتوں کو قرآنِ حکیم نے مدبرات کے نام سے موسوم کیا ہے۔

فرشتے نور سے پیدا کیے گئے۔ مسلم نے حضرت عائشہ کی روایت درج کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا خلقت الملائکۃ من النور [2]

وہ خطا و معصیت سے پاک ہیں۔ انھیں اختیار ہی نہیں دیا گیا کہ بدی کر سکیں ان کا کام ہی ربُ العزت کی تسبیح و تحمید ہے۔ کھانے، پینے، سونے کی تمام حاجتوں سے مستغنی ہیں مختلف مذاہب میں دیوی دیوتاؤں کا جو غلط عقیدہ پایا جاتا ہے وہ اس حقیقت کی بگڑی ہوئی شکل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے مختلف محکموں اور شعبوں پر الگ الگ فرشتے مقرر فرما رکھے ہیں جو احکامِ الٰہی کے مطابق ان میں تصرف کرتے اور ان کا انتظام چلاتے ہیں۔ قرآن نے جگہ جگہ اس بے بنیاد عقیدے کی تردید کی ہے کہ وہ مستقل بالذات حاجت روا یا خدا کی بیٹیاں ہیں۔ صاف صاف فرمایا کہ ان کی حیثیت بس اتنی ہے کہ:

---

[1] تفسیر قاضی البیضاوی الجزءالاول ص 62

[2] فتح الباری جلد 6 ص 216

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔

(وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جو کچھ انھیں حکم دیا جاتا ہے اُسے بجا لاتے ہیں۔)

فرشتوں کی تعداد کیا ہے؛ قرآنِ حکیم نے کہا۔

مَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ۔

(اور تیرے رب کے لشکر اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔)

احادیث میں ان کی صفات کثرت سے وارد ہیں جسے تفصیلات کا شوق ہے وہ ابنِ کثیر کی البدایہ والنہایہ کے باب ذکرِ خلق الملائکۃ وصفاتہم علیہم السّلام" کی طرف رجوع کرے۔

فلاسفہ کا نقطۂ نظر

فرشتوں کے متعلق ان عقائد پر شروع سے لے کر اب تک قریب قریب تمام اُمت کا اتفاق چلا آرہا ہے۔ اسلام میں فلاسفہ کے ایک گروہ کے علاوہ شاید ہی کسی کے ہاں ملائکہ کے تعین میں ان شاعرانہ خیالات کا سُراغ ملتا ہو جنھیں آج ہمارے ہاں کے بعض "مفکرِ قرآن" بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کر رہے ہیں فلاسفہ پر تعقل و تفلسف کا غلبہ ہُوا تو جہاں اُنھوں نے کلامِ باری اور وحی والہام کی حقیقت کے مُتعلق بعض مضحکہ خیز منطقی تاویلوں سے کام لیا، وہاں ملائکہ کے بارے میں بھی کہہ گزرے کہ ان کی حقیقت عقلِ فعال کے فیضان سے زیادہ نہیں۔ فارابی نے جنھیں مُسلم فلاسفہ کا سرگروہ مانا جاتا ہے، ملائکہ کے بارے میں تحریر فرمایا۔

الملئكة صور علمية جواهرها علوم ابداعيه ليست كالالواح فيها نقوش او صدور فيها علوم بل هي علوم ابداعية قائمة بذواتها تلحظ الامر الاعلى فينطبع في هوياتها ما تلحظ وهي مطلقة لكن الروح القدسية تخاطبها في اليقظة والروح البشرية تعاشرها في النوم [1]

(ملائکہ صور علمیہ ہیں جن کا جوہر ابداعی علوم ہیں وہ ان تختیوں کے مانند نہیں ہیں جن میں نقوش ہوتے ہیں اور نہ ان سینوں کی طرح ہیں جن میں علوم ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ ابداعی علوم ہیں جو بالذات قائم ہیں، امورِ اعلیٰ کا ملاحظہ کرتے ہیں۔ پس جن امور کا وہ ملاحظہ کرتے ہیں وہ امور اُن کے وجود پر منطبع ہو جاتے ہیں باایں ہمہ وہ مطلق و مجرد ہیں۔ لیکن روحِ قدسی ان سے بیداری کے عالم میں ہمکلام ہوا کرتی ہے اور روحِ بشری خواب میں ان کی صحبت میں رہتی ہے۔)

ملائکہ کے بارے میں فلاسفہ کا عقیدہ مندرجہ بالا اقتباس سے پوری طرح سمجھ میں نہ آیا ہو تو ابنِ تیمیہؒ کے ان تشریحی کلمات کا سہارا لیجیے۔

وَان الملئكة هي ما يتخيل في نفسه من الخيالات النورانية وَكلام الله هوَ ما يسمعهُ في نفسه من الاصوات بمنزلة لما يراه النائم في منامهِ

(ان لوگوں کا ملائکہ کے متعلق خیال یہ ہے کہ ان کی حقیقت وہ نورانی خیالات ہیں جن کا وہ طلب گارِ نبوت اپنے دل میں تخیل کرتا ہے اور اللہ کا کلام ان کے نزدیک وہ آوازیں ہیں جنھیں وہ طلب گارِ نبوت اپنے دل میں سنتا ہے جس طرح کوئی سونے والا خواب میں چیزوں کو دیکھتا ہے۔)

---

[1] الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ ص 402

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے زمانے میں کچھ اسی سے ملتا جلتا عقیدہ ایک بزرگ کا مشہور ہوا۔ وہ بزرگ خود تو وفات پا چکے تھے۔ عالمگیرؒ نے ان کے خلفا کی فہرست طلب کی ان میں سے بھی بیشتر اللہ کو پیارے ہو چکے تھے ان بزرگ کے جانشین کی طلبی ہوئی اور اورنگ زیب عالمگیر نے حکم دیا کہ اس سلسلے میں ان کے مرشد کی جو تحریریں پائی جاتی ہیں انھیں نذرِ آتش کر دیا جائے۔ قریب کے زمانے میں سرسید احمد خاں مرحوم کا عقیدہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ مثلاً اپنی کتاب تفسیر احمدی میں انھوں نے لکھا ہے۔

"خدا اور پیغمبر میں بجز اس ملکۂ نبوت کے (جس کو ناموسِ اکبر اور شرع میں جبرائیل کہتے ہیں) اور کوئی ایلچی پیغام پہنچانے والا نہیں ہوتا اس کا دل ہی وہ ایلچی ہوتا ہے۔ جو خدا کے پاس پیغام لے جاتا ہے اور خدا کا پیغام لے آتا ہے۔ وہ خود ہی وہ مجسّم چیز ہوتا ہے جس میں سے خدا کے کلام کی آوازیں نکلتی ہیں وہ خود ہی وہ کان ہوتا ہے جو خدا کے بے حرف و صوت کلام کو سنتا ہے۔ خود اس کے دل سے فوارہ کی مانند وحی ابلتی ہے اور خود اسی پر نازل ہوتی ہے اس کا عکس اس کے دل پر پڑتا ہے جس کو وہ خود ہی الہام کہتا ہے اس کو کوئی نہیں بلواتا وہ خود بولتا ہے۔[1]

غیر انبیاء پر ملائکہ کا نزول

ملائکہ کے باب میں اہلِ علم کے ہاں ایک بحث اور بھی پیدا ہوئی ہے اور وہ یہ کہ کیا فرشتے انبیاء کے علاوہ دوسرے صلحاء اور اتقیاء سے بھی ہم کلام ہوتے ہیں؟

[1] تفسیر احمدی ص 31 تا 33

اور اگر ہوتے ہیں تو انبیاء اور غیر انبیاء پر ان کے نزول میں فرق کیا ہے ؟

قرآنِ حکیم فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ"

(وہ لوگ جو کہتے ہیں اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہتے ہیں ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔)

دیکھا جائے تو یہی ایک آیت توضیح مدّعا کے لیے کافی ہے کہ اس میں انبیاء کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی۔ مگر بعض لوگوں نے یہاں اس توجیہہ سے کام لیا کہ زیرِ بحث آیت میں ملائکہ سے مُراد نزولِ رحمت ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ ایسے لوگ اللہ کی رحمت کے مستحق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خفیہ قوتیں ان کی ہمت اور ڈھارس بندھاتی ہیں اس توجیہہ کے لیے کتاب اللہ میں کوئی قرینہ موجود ہے کہ نہیں تو اہلِ نظر خود فیصلہ فرمائیں۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لیے اس تشریح کو قبول بھی کر لیا جائے تو ہم عرض کریں گے کہ اس سلسلہ میں مدارِ بحث صرف یہی ایک آیت تو نہیں۔ کتاب پاک کے بعض دُوسرے مُقامات سے بھی تو غیر انبیاء پر نزُولِ ملائکہ کی صراحت ہو رہی ہے۔ آخر وہاں کیا مفہوم و مُدعا مُراد لیا جائے گا؟ سورۃ آلِ عمران میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَ طَھَّرَکِ وَ اصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ۔

(اور جب کہ فرشتوں نے کہا۔ اے مریم! بے شک اللہ تعالےٰ نے تمھیں منتخب فرمایا ہے اور پاک بنایا ہے۔ اور تمھیں جہان بھر کی خواتین پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے۔)

اس آیت کے ذریعے صاف ثابت ہوا کہ فرشتے حضرتِ مریم سے ہم کلام ہوئے حالانکہ وہ نبی یا رسول نہیں تھیں اور یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ کوئی خاتون مقامِ نبوت پر فائز نہیں ہوئی۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو مسائل السلوک از مولانا تھانوی

خلافتِ آدم

بحث کا آغاز اس آیت سے ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے خلیفہ کے لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں۔

من تو لك خلف فلاں فلانًا فی هذا الامر اذا قام مقامه فیه بعده

(یعنی جب کوئی شخص کسی کے بعد اس کا قائم مقام بنتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اس معاملہ میں فلاں کا نائب ہوا۔)

تائید میں انھوں نے سورۃ یونس کی یہ آیت پیش کی۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ۔

(پھر ہم نے ان کے بعد زمین میں تمھیں ان کا قائم مقام بنایا تاکہ یہ دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔)

امام راغب اپنی مفردات میں لکھتے ہیں۔

الخلافة النيابة عن الغير اما بالغيبة المنوب عنه و اما لموته و اما لعجزه و اما لتشريف المستخلف

(خلافت کا مطلب ہے کسی کی نیابت کرنا خواہ یہ نیابت اس کی غیبت کی وجہ سے ہو یا اس کی موت اور عجز کے باعث یا اس مقصد کے لیے کہ اس سے مستخلف کی تعظیم ظاہر ہو۔)

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ آدم کو دنیا میں جس وجہ سے اپنا قائم مقام بنا رہا تھا

وہ نہ غیبت ہو سکتی ہے نہ العیاذ باللہ موت و عجز۔ اس کا مقصد ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے بنی آدم کا شرف و مجد اور عظمت و تکریم ظاہر ہو۔ اللہ اللہ ایک مُشتِ خاک کا یہ مقامِ بلند کہ خود خالق اُسے اپنا نائب قرار دے رہا ہے۔ اور نائب بھی کیسا صرف اُمورِ تشریعی میں نہیں، اُمورِ تکوینی میں بھی یہ قید اس نے کہیں بھی تو نہیں لگائی کہ دُنیا میں جو خلیفہ بنانے والا ہُوں وہ صِرف اُمورِ تشریعی میں میری نیابت کرے گا۔ آج لوگ حیران ہیں کہ حضرتِ انسان کس طرح عناصرِ اربعہ پر فرمانروائی کر رہا ہے، کس طرح راکٹ بھیج بھیج کر چاند پر پہنچنے کی تیاریاں کر رہا ہے لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ جب اللہ تعالےٰ نے اُمورِ تکوینی میں بھی اوّل روز سے آدم کو خلیفہ بنا کر بھیجا تو پھر ایجادات و انکشافات پر تعجّب کیسا؟ یہ تو ابھی معمولی باتیں ہیں ان واقعات سے بھی بڑھ کر حیرت ناک واقعات رُونما ہوں تو عین توقع کے مطابق ہوں گے۔

انسان کو خلیفہ کیوں بنایا

جان لینا چاہیئے کہ انسان سے پہلے اللہ تعالےٰ کی مخلُوق میں جِن اور فرشتے موجُود تھے اور بعض روایات کے مُطابق تو اللہ تعالےٰ نے آدم کو خلافت سونپنے سے پہلے جِنوں کو زمین میں اپنا نائب مُقرّر کیا تھا۔ ان میں سے پہلی مخلُوق آگ سے اور دُوسری نُور سے پیدا ہُوئی اور اس لحاظ سے ان کا وجُود حد درجہ لطیف تھا۔ آگ سے پیدا ہونے کے باعث جِنوں کو نہ مکان کی ضرُورت تھی نہ اپنی حِفاظت کے لیے طرح طرح کے ہتھیاروں کی۔ گویا اس کائنات کی رنگا رنگ نعمتوں سے نفع تو حاصل کرتے تھے مگر نامکمل اور ناقص رنگ میں یہی حال ملائکہ کا ہے کہ وہ نہ زن و شو کے تعلقات کی حاجت رکھتے ہیں نہ ان میں سلسلۂ تولید

ہے کہ وہ اپنی نسل کو بڑھا سکیں، یہاں تک کہ وہ خورد و نوش کی ضروریات سے بھی مُبرّہ و منزّہ ہیں۔ (انھم لایأکلون[1]) ادھر خالقِ کائنات کی خواہش یہ تھی کہ خلیفہ ایک ایسی مخلوق کو بناؤں جو تمام حاجات اور ضروریات رکھتی ہو۔ اور "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کے مصداق زمین میں چھپے ہوئے خزانوں سے انتفاع پذیر ہو سکے۔ ایک حدیث قدسی ہے۔

کنتُ کنزًا مخفیًا فاَحببتُ ان اُعرف فخلقت الخلق

(میں ایک مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق پیدا کی)

انسان عناصرِ اربعہ سے پیدا ہُوا۔ آب و خاک و باد و آتش سے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ چاروں ایک دُوسرے کی ضِد واقع ہوتے ہیں اور ہر ضد کا خاصّہ یہ ہے کہ وہ دُوسری ضِد کو مٹانے کی پیہم جد و جہد کرتی ہے اِسی سے فساد رُونما ہوتا ہے اور فرشتوں کا یہ اندازہ کہ انسان دنیا میں جا کر فساد پھیلائے گا اور خُون بہائے گا اسی خلقِ اضداد پر مبنی تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی انسانی قوتیں جن سے آج تخریبِ کائنات کا کام لیا جا رہا ہے اک ذرا سانچے میں ڈھال لی جائیں تو انسان کو فرشتہ اور جنّ سے بھی افضل بنا دیتی ہیں۔ انسانی سرشت اور مزاج پر غور کیا جائے تو اس میں دو قوتیں سب سے آگے آگے نظر آتی ہیں ایک قوّتِ شہویہ اور دُوسری قوتِ غضبیہ۔ قوتِ شہویہ وہ ہے جس کے ذریعے ایک بُرے انسان سے بدکاری سرزد ہوتی ہے اور وہ لذّاتِ نفس کا غُلام بن جاتا ہے۔ اسی طرح قوتِ غضبیہ وہ چیز ہے جس کے ذریعے جنگ و جدال

---

[1] فتح الباری جلد 6 ص 217

CENTRAL URDU LIBRARY
URDU HALL HIMAYATNAGAR
HYDERABAD 500029

اور لڑائی جھگڑے ہوتے اور کمزوروں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں بظاہر نظر یہ دونوں قوتیں مبغوض نظر آتی ہیں۔ لیکن دیکھا جائے تو انھی کا رُخ موڑ دینے پر آدمی کے اشرفُ المخلوقات ہونے کا انحصار ہے۔ ایک مومن اسی قوّتِ شہویہ سے کام لیتے ہُوئے جب اللہ تعالےٰ کی محبّت کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور دُنیا و مافیہا کو اس کے تابع بنا دیتا ہے تو اس وقت ملائکہ بھی اس کی برابری نہیں کر پاتے کہ ان میں یہ قوّت موجُود نہیں جس سے عشق و محبت کا یہ غیر فانی چشمہ اُبل سکے۔ نہ نالۂ نیم شبی فرشتوں کے حصّہ میں آیا نہ سوزِ آرزُو۔ یہ دولت صرف اور صرف انسان کی ملکیّتِ خاص ہے۔ بقولِ اقبال ؎

بگو جبریل را از من پیامے
مرا آن پیکرِ نوُری نداد ند
دلے تاب و تبِ ماخاکیاں بیں
بنوُری ذوقِ مہجوُری نداد ند

یہی معاملہ قوّتِ غضبیہ کا ہے ایک مومن و مُسلم جب اس طاقت کو مُشرّف باسلام کر لیتا ہے تو اس کے ذریعے شہادت کے مراتبِ عالیہ تک جا پہنچتا ہے وہ خدا کے دُشمنوں کے ساتھ جنگ کرتا ہے اور ضرُورت پڑتی ہے تو اس کی راہ میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

اب اس مسئلہ کو ایک اور پہلو سے دیکھئے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی کوئی حد نہیں حدیث شریف میں جو یہ آیا کہ اللہ تعالےٰ کے ننانوے نام ہیں بعض لوگوں نے اس سے یہی سمجھا کہ ۹۹ سے مراد "ایک کم سو" کا عدد ہے حالانکہ مقصُود اس سے اسماء کی کثرت کا اظہار تھا۔ وگرنہ محُدود و مُقیّد اذہان اس لامحدود ذات کی جُملہ صفات کا ادراک کہاں کر سکتے ہیں۔ یہ اسمائے حسنیٰ فرشتوں کو بھی معلُوم

ہیں وہ اللہ کی تسبیح وتحمید کرتے ہوئے ضرور ناموں کو وِردِ زبان رکھتے ہوں گے مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ جب تک کوئی کیفیت کسی پر گزر نہ جائے اس وقت تک وہ صحیح معنوں میں اس کا لذت چشیدہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے ناموں میں "محی اور ممیت" کے بھی الفاظ ہیں۔ لیکن حیات وموت کی کیفیات جس طرح بنی آدم پر وارد ہوتی ہیں فرشتے ساحل پر کھڑے ہو کر ان کا صحیح اندازہ کہاں لگا سکتے ہیں اسی طرح وہ یہ تو جانتے ہیں کہ اللہ کی ایک صفت شافی ہونا بھی ہے کہ وہ مریضوں کو شفا بخشتا ہے مگر جب تک حالتِ مرض میں خود مبتلا نہ ہو جاتے اس وقت تک اس شافیٔ مطلق کے کمالِ رحمت کا تصور کہاں ہو سکتا ہے۔؟ میر تقی میر نے ٹھیک کہا ہے

آدمِ خاکی سے عالم کو جِلا ہے ورنہ
آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

فرشتوں کا استفسار

اللہ تعالیٰ نے آدم کو تاجِ خلافت پہنانا چاہا تو فرشتوں سے اس کا ذکر فرمایا فرشتے دیکھ چکے تھے کہ آدمِ خاکی کو ارادہ و اختیار کی طاقت دے کر بھیجا جا رہا ہے اس لیے اُن کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ انسان دُنیا میں جا کر فساد اور خونریزی کا مرتکب ہو گا۔ وہ بے اختیار کہہ اُٹھے۔

اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ

(کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسوں کو جو اس میں فساد کریں گے اور خونریزیاں کریں گے۔)

یہ انداز اعتراض کا نہیں تھا کہ یہ بات تو اُن کی سرشت کے منافی ہے

یہ حُسنِ طلب کا تھا۔ عرض یہ کیا جارہا تھا کہ اے جہانوں کے مالک! جسے آپ اپنا نائب بنارہے ہیں، آپ سے بڑھ کر کس کو علم ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر کچھ پہلو خرابی کے بھی ہیں اور پھر ہم آپ کے مخلص غلام موجود ہیں جن کا کام ہی شب و روز تسبیح و تحمید ہے کیوں نہ ہم ہی اس خدمت کی بجا آوری کا اعزاز حاصل کریں؟

فرشتوں کے اس ملتجیانہ استفسار کے بعد ضروری تھا کہ خلاّقِ عالم ان پر اپنے خلیفہ کی برتری اور فضیلت ظاہر فرمائے چنانچہ جواب ارشاد فرمایا گیا اور جواب بھی دو طرح کا ایک حاکمانہ اور ایک حکیمانہ۔ حاکمانہ جواب تو یہ تھا کہ

اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

(میں جانتا ہوں اس بات کو جو تم نہیں جانتے۔)

یعنی میرے ہر فعل میں جو اسرار و حکم پوشیدہ ہیں تم اُن کی کُنہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ تمہارا کام تو بس اطاعت ہی اطاعت ہے۔ تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے کہ میرے کسی حُکم کی تہہ میں کیا مصلحتیں پنہاں ہیں مگر اس حاکمانہ رنگ میں جواب دینے کے ساتھ ساتھ ازراہِ شفقت و رحمت فرشتوں کو آدمؑ کے مقامِ بلند کی ایک تھوڑی سی جھلک بھی دکھادی۔

عِلمُ الاسماء

قُرآن پاک کہتا ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا

(اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو سب چیزوں کے ناموں کا۔)

یہ اسماء کن چیزوں کے تھے؟ مُفسّرین اور اہلِ علم کے درمیان اس میں اختلاف

ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ وہ چیزیں تھیں جن سے انسان کو دُنیا میں سابقہ پیش آنا تھا۔ بعض کے نزدیک یہ نام فرشتوں کے تھے۔

حدثنا عبد اللہ بن ابی جعفر عن ابیہ عن ربیع قولہٗ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا قال اسماء الملئکۃ۔

متاخرین میں سے بعض اصحاب نے کہا کہ یہ نام تمام انبیاء و رُسل کے تھے اور ان ناموں کے ذریعے فرشتوں کو بتایا یہ جا رہا تھا کہ تم جس آدم خاکی کو اتنا کم وقیع سمجھ رہے ہو اسی کی ذُرّیت سے کل وہ مُقدّس وجُود پیدا ہوں گے جن تک ہمارا پیغام پہنچاتے ہُوئے تم فخر محسُوس کرو گے۔

جن مفسّرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ نام کائنات کی جملہ چیزوں کے تھے ان پر یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ قرآنِ حکیم میں لفظ "عَرَضَھُم" کا آیا ہے جو ذی عقل لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں بے جان چیزیں مُراد نہیں ہو سکتیں[2] لیکن مُفسّر ابن کثیرؒ نے اس کے ردّ میں قرآنِ حکیم ہی سے آیات پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ جہاں ذی عقل اور غیر ذی عقل سب مُراد ہوں وہاں جو لفظ لایا جاتا ہے وہ عقل و ہوش رکھنے والوں ہی کا لایا جاتا ہے۔ اور ویسے بھی قرینِ قیاس یہ ہے کہ جب انسان کو خلافتِ ارض سونپی جا رہی ہے تو اسے جُملہ اشیاء کی حقیقت و ماہیت سے بھی آگاہ کیا جائے اور دیکھا جائے تو اسی اصلیت و ماہیت کے وقوف پر ابنِ آدم کی فضیلت کا انحصار ہے۔ بادشاہ اگر پُوری طرح اپنی رعیّت سے واقف نہ ہو تو اس پر حکم کیا چلائے گا۔؟

قرآن کہتا ہے کہ جب وہی چیزیں فرشتوں کے سامنے پیش کی گئیں تو وہ اُن کے خواص اور ان کی اصلیت سے بے خبر نکلے۔ اس پر آدمؑ کو حکم ہُوا کہ وہ ان چیزوں کے نام بیان کرے اور جب آدمؑ نے اس حکم کی تعمیل کی تو فرشتے پکار اُٹھے

---

[1] ابن جریر طبری بحوالہ ابنِ عباسؓ۔ [2] ایضاً ابن جریر طبری

سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ۔

(تُو پاک ہے۔ ہم نہیں جانتے مگر وہی کچھ جس کا تُو نے ہمیں علم دیا۔ بے شک تُو بڑا علم والا اور حکمت والا ہے۔)

قصّہ آدم و ابلیس کے اس جزو سے متعدد اہم نتائج مستنبط ہوتے ہیں۔

پہلا یہ کہ فرشتہ نام کی جو مخلوق اس کارگاہِ فطرت میں سرگرم کار ہے اس کی حیثیت معبُود کی نہیں عبدِ محض کی ہے۔ فرشتے اتنا ہی کچھ جانتے ہیں جتنا انھیں بتایا گیا ہے وہ ہر بات میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔

دُوسرا یہ کہ دین و شریعت کے جن احکام کی غایت و مصلحت سمجھ میں نہ آئے ان کا انکار کر دینا سخت نادانی اور حماقت ہے یقین یہ رکھنا چاہیے کہ خدائے علیم و حکیم کے ہر حکم میں مصلحتوں اور حکمتوں کا ایک سمندر موجزن ہے۔ یہ ہماری عقل کی کوتاہی ہے کہ ہم اس کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔

تیسرا یہ کہ انسان کو ملائکہ پر جو فضیلت حاصل ہے اس کا باعث علم ہے اقبال نے کہا۔

کجُا نوُری کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند
کجُا خاکی کہ در آغوشِ دارد آسمانے را

مولیٰنا رُوم کہتے ہیں۔

بوا البشر کو علم الاسماء بگ است
صد ہزاراں علمش اندر ہر رگ است
چشمِ آدم کو بنورِ پاک دید
جان و سرِ ناسہا گشتش پدید

چوں ملائک نورِ حق دیدند ازو
جملہ افتادند در سجدہ ازو

"ابوالبشر کو جو علم الاسماء کی وجہ سے بیگ (سردار) ہیں اُن کی رگ رگ میں اس کے ہزاروں علوم سمائے ہوئے ہیں۔ آدم کی آنکھ نے نورِ حق سے دیکھا تو اس پر ان ناموں کے تمام اسرار و رموز منکشف ہو گئے اور جب فرشتوں نے اس کی ذات سے نورِ حق کا نظارہ کیا تو وہ سب کے سب اس کے آگے سجدے میں گر پڑے۔"

سجدے کا حکم

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیفہ کی علمی عظمت ظاہر فرمادی تو فرشتوں کو حکم ہوا کہ وہ آدم کے آگے سجدہ کریں۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا

(اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا۔)

سجدہ کا یہ حکم کن فرشتوں کے نام صادر ہوا تھا؟ کیا اس میں سبھی فرشتے شامل تھے یا صرف ملائکۃ الارض۔ مفسرین کے درمیان اس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ حکم صرف ملائکۃ الارض کے نام تھا[1] لیکن جمہورِ اُمت کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ حکم عام تھا اور اس میں سب فرشتے شامل تھے۔ غور کیا جائے تو اس میں جمہور ہی کا مسلک درست نظر آتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے ملائکہ کا لفظ استعمال

---

[1] ابن جریر طبری من طریق الضحاک من ابن عباسؓ

فرمایا ہے اور اس میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ اگر مخاطب صرف "زمینی" فرشتے ہوتے تو کلام میں اس تخصیص کا کوئی نہ کوئی قرینہ ضرور پایا جاتا۔

سجدے کا حقیقی مفہوم

یہاں لفظِ سجدہ کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اس میں مفسرین کے ہاں عام طور پر تین نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ بعض نے اس کے لغوی معنے مراد لیے ہیں۔ اور لغت میں اس کا مطلب ہے کسی کے آگے ذلت و عجز اختیار کرنا۔ صاحبِ تفسیر مظہری کہتے ہیں۔

والسجود فی الاصل التذلل

"سجدہ اصل میں تذلل کا نام ہے۔"

امام راغب کہتے ہیں۔

"السجود اصلة التطامن والتذلل"

اہلِ علم کے اس گروہ کے نزدیک قرآن مجید میں سجدے کا لفظ درختوں اور پتھروں تک کے لیے وارد ہوا ہے اس لیے ضروری نہیں کہ اس کے معنی زمین پر پیشانی ٹیکنے کے لیے جائیں۔ قرآن کہتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(تو کیا تو نہیں دیکھتا کہ آسمان اور زمینوں میں جتنی بھی اشیاء ہیں وہ سب کی سب اللہ کی سجدہ گزار ہیں۔)

قرآن میں جہاں بنی اسرائیل کے فلسطین میں فاتحانہ شان و شوکت سے داخل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں کہا گیا ہے کہ انھیں حکم ملا

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا

جناب عبداللہ ابنِ عباسؓ اور امام رازیؒ جیسے جلیل القدر مفسرین نے بھی سجدہ کے معانی بیان کرتے وقت تواضع و تذلل، عجز و انکسار اور خاکساری و فروتنی کو بھی سجدہ کا ہم معنی ٹھہرایا ہے [1]

سجدہ کی طرح "تسبیح" کا لفظ بھی قرآن نے جاندار اور غیر جاندار سب کے لیے استعمال کیا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ

(ساتوں آسمان و زمین اور ان میں جو کچھ بھی ہے سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔)

کہنے والوں نے کہا کہ یہاں بھی اس طرح زبانِ قال سے تسبیح کرنا مراد نہیں جس طرح انسان کرتے ہیں۔ بلکہ مقصودِ بیان زبانِ حال سے تمام اشیاء کا حمد باری میں رطب اللسان ہونا ہے۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے متعدد دلائل ان اہلِ علم کو اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں کہ حق تعالےٰ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے صرف جھکنے کا حکم دیا تھا۔ ماتھا ٹیکنے اور نماز کا سا سجدہ ادا کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

سجدۂ تعظیمی؟

اہلِ علم کے ایک دوسرے گروہ کی رائے میں سجدہ تو یہ ضرور تھا مگر وہ سجدہ جسے سجدۂ تعظیمی کہتے ہیں اور جو پہلی شریعتوں میں رائج تھا۔ قصۂ یوسف علیہ السلام میں جب یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کے ہمراہ مصر میں داخل ہوتے ہیں تو قرآن حکیم نے وہاں خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا کے الفاظ ارشاد فرماتے ہیں اور مفسرین

---

[1] تفسیر الطبری و تفسیر کبیر۔

کی ایک جماعت کے نزدیک وہاں بھی سجدے سے مُراد سجدۂ تعظیمی ہے ان حضرات کا کہنا ہے کہ

کان جائز فی الامم السابقة

"یہ پچھلی اُمتوں میں جائز تھا" مگر

نسخت فی هذه الشریعة

"اس شریعت میں یہ منسوخ قرار دے دیا گیا"

ترمذی ابُو داؤد باب النکاح کی ایک روایت کا مفہوم بھی قریب یہی ہے۔

ایک اور نقطۂ نظر

مُفسّرین کی ایک جماعت کے خیال میں فرشتے آدم کے سامنے اس طرح جُھکے تھے جس طرح عام سجدہ میں جُھکا جاتا ہے۔ مگر یہ سجدہ آدم کے سامنے نہیں، خداوند عالی جناب کے حضور تھا۔ آدم کی حیثیت محض اس میں قبلہ کی سی تھی۔ بعینہٖ اس طرح جس طرح مُسلمان خانہ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ مگر رکُوع و سجُود خانہ کعبہ کے سامنے نہیں بلکہ ربِّ کعبہ کے سامنے ہوتا ہے۔ سجدہ کی اس تعبیر پر جو سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا "لِآدمَ" میں "ل" کو "اِلیٰ" کے معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا عربی ادب اور قرآن میں اس کے نظائر موجُود ہیں؟ مُفسّرین کے اس گروہ نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے اور تائید میں متعدد مضبُوط دلائل پیش کیے ہیں۔ صاحبِ تفسیر مظہری نے حضرتِ حسّانؓ ابنِ ثابت کا وہ شعر نقل کیا ہے جو انھوں نے حضرت ابُوبکرؓ کی شان میں کہا تھا۔

الیس اوّل من صلی لقبلتکم
و اعرف الناس بالقرآن و السنن

"کیا وہ پہلے (مومن) نہیں ہیں جنھوں نے تمھارے قبلہ کی طرف نماز ادا کی۔ اور کیا وہ لوگوں میں سب سے بڑھ کر قرآن وسُنّت کا عِلم نہیں رکھتے۔"

شعر کے مصرعہ اوّل سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں "ل" کو بمعنی "اِلیٰ" استعمال کیا گیا ہے خود قرآنِ حکیم میں "عند" کے معنوں میں "ل" کے استعمال کی نظیر موجود ہے فرمایا گیا۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ

یہ اور اسی طرح کی دُوسری مُتعدد مثالیں پیش کرتے ہوئے ان حضرات نے ثابت کیا ہے کہ قصّہ آدم وابلیس میں حُکمِ سجدہ سے مُراد آدم کو مسجُود کا مرتبہ عطا کرنا نہیں تھا بلکہ اُسے قبلہ کی حیثیت دے کر اس کے عزّ و شرف اور منصب و مقام کا اظہار پیشِ نظر تھا۔

بہر حال ان تینوں نقطہ ہائے نظر میں بات جونسی بھی وزنی نظر آتی ہو اس حقیقت کے ماننے میں کسی کو تامّل نہیں ہو سکتا کہ حقِ تعالےٰ نے کاروبارِ دُنیا چلانے میں فرشتوں کو انسان سے تعاون کرنے بلکہ اس کی متابعت کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ اور سجدہ گزاری کا یہ ارشاد دراصل اسی منشائے باری کے اظہار کی ایک صُورت تھی خلیفۃُ الارض کی حیثیت متقاضی ہے کہ دُنیا میں عناصرِ اربعہ پر اس کی حکمرانی قائم ہو۔ ہوا اور پانی سے لے کر جنّات اور چرند پرند تک سب اس کے زیرِ نگین ہوں اور خلافتِ الٰہیہ کا کامل نمُونہ چُونکہ انبیائے کرام کی ذاتِ بابرکات ہے اسی لیے ان کے افعال واعمال میں اس حکمرانی کا کامل ظہُور نظر آتا ہے۔ زمینی حکومت کے تمام فرائض سے انسان تبھی عُہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ جب مختلف شُعبہ جاتِ زندگی پر مقرّر فرشتے اس مُعاملہ میں انسان کو جملہ سہُولتیں بہم پہنچائیں۔ احادیثِ نبوی سے معلوم ہوتا

ہے کہ حقِ تعالےٰ نے کائنات کے انتظام و انصرام کے لیے مختلف فرشتوں کو مامور کر رکھا ہے۔ سجدہ کے حکم کے ذریعے ان سب پر واضح کر دیا گیا کہ انسان دُنیا میں جاکر مقصدِ خلافت کے مطابق عمل کرے یا خلاف، اپنے اختیارات کو عدل و راستی سے استعمال میں لائے یا سرکشی و نافرمانی سے، ہماری مشیّت جب تک اس کو اذنِ کار دے رہی ہے تمھیں اس کی راہ میں حائل ہونے کی ضرورت نہیں تمھارا کام صرف یہ ہے کہ تم تا حکمِ ثانی اس کے مقصد و مدّعا کو پورا کرنے میں اس کا ہاتھ بٹاؤ۔

اِبلیس کا انکار

آدم کے سامنے فرشتوں کے سجدہ ریز ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن نے ابلیس کے انکار کا بھی ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ

(فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس[1] نے نہ کیا۔ اس نے انکار کیا وہ تکبّر میں آگیا اور کافروں میں سے ہوگیا[2])

قرآن کے اس اذکار پر اکثر لوگوں کے ذہن میں بہت سے استفسارات سر اٹھاتے ہیں مثلاً:

---

[1] بعض مفسّرین نے کہا "اِلّا اِبلیس" کا یہ مطلب نہیں کہ ابلیس کے سوا دُوسرے فرشتوں نے سجدہ کر لیا بلکہ یہ استثنائے منقطع ہے یعنی الا کے ذریعے جس چیز کو بیان میں علیحدہ کر دیا وہ اوّل الذکر جنس سے تعلق نہیں رکھتی۔ ایک دُوسری جنس سے متعلق ہے۔

[2] وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ کا ایک ترجمہ اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ابلیس کافروں میں سے تھا۔ اس صُورت میں مطلب یہ لیا جائے گا کہ علمِ الٰہی میں تو ابلیس پہلے کافر تھا مگر اس کے کُفر کا باقاعدہ اظہار اس موقع پر ہوا۔

۱۔ ابلیس کا مفہوم کیا ہے۔؟
2۔ کیا یہ کسی متعین شخصیت کا نام ہے؟
3۔ یہ کون سی مخلوق سے تعلق رکھتا ہے؟
4۔ کیا وہ سجدے کے حکم میں شامل تھا؟ آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سجدے کا حکم صرف فرشتوں کے نام تھا؟

ابلیس کا مفہوم

ابلیس بروزن افعیل ہے اور اس کا مصدر ہے ابلاس۔ ابلاس کے معنی ہیں "مایوسی"۔ ابو جعفر طبری کہتے ہیں۔

وھو الایاس من الخیر من الندم والحزن

قرآنِ حکیم میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ

(قیامت کے دن مجرموں پر مایوسی طاری ہوگی۔)

قرآن نے بعض دوسرے مقامات پر ابلیس کے لیے "الشیطان" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ شیطن کے لغوی معنے بعید ہونے کے ہیں۔ ابلیس چونکہ نیکی اور رحمت سے دور ہے اس لیے اسے شیطان کہا گیا ہے۔ بعض دوسرے اصحاب کی رائے میں یہ عربی میں فعلان کے وزن پر ہے اور شاط یشیط سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے جلنا اور ہلاک ہونا۔ ابلیس دنیا میں حسد کے مارے جل رہا ہے اور آخرت میں دوزخ کی آگ اس کا ٹھکانا ہوگا۔ اس لیے قرآن نے اسے

لے تفسیر الطبری جلد ۱ ص 309

شیطان سے موسوم کیا۔ ابلیس اور شیطان کے محلِ استعمال میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر تو خاص اس بڑے شیطان کا نام ہے اس کے سوا کسی اور کے لیے نہیں بولا جاسکتا۔ مگر شیطان انسانوں اور جنوں میں سے ہر سرکش اور نافرمان کو کہا جاسکتا ہے قرآن ہی میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ

(اور اسی طرح ہم نے شیاطینِ انس وجن کو ہر نبی کا دشمن بنادیا۔)

قرآن وحدیث میں شیطان یا ابلیس کی سرگرمیوں اور کارستانیوں کا جو تذکرہ کیا گیا ہے بعض لوگوں نے بزعمِ خویش اسے مطابق عقل بنانے کے لیے یہ تاویل کی ہے کہ شیطان یا ابلیس کسی خارجی وجود کا نام نہیں بلکہ یہ نفسِ امّارہ ہی کے لیے ایک استعارہ ہے۔ مگر ہم عرض کریں گے کہ اس نقطۂ نظر کے لیے قرآنی تعلیمات میں قطعاً کوئی گنجائش موجود نہیں۔

مثلاً سورۂ ابراہیم میں قرآن دوزخیوں سے شیطان کا ایک تخاطب بیان کرتے وقت کہتا ہے۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ

(اور جب قصہ ختم ہوا تو شیطان نے کہا اللہ نے تم سے ایک سچا وعدہ کیا تھا۔)

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

(اور میری تم پر کچھ حکومت نہ تھی مگر یہ کہ میں نے بلایا تم کو، پھر تم نے مان لیا میری بات کو سو الزام نہ دو مجھ کو اور الزام دو اپنے آپ کو۔)

اس آیت سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ نفسِ انسانی کے علاوہ کوئی دوسرا خارجی وجود ہے جسے انسان اپنی گمراہی کا سبب قرار دے رہا ہے۔ مگر وہ جواب میں

کہتا ہے کہ تم پر میری کوئی حکومت تو قائم نہ تھی۔ تم ایک بااختیار مخلوق تھے تم نے اپنے ارادہ و اختیار سے میری دعوت پر لبیک کہی۔ اب اپنی معصیت کے لیے مجھے موردِ الزام کیوں قرار دے رہے ہو؟ اگر شیطان، انسان کے اپنے ہی نفس کا نام ہوتا تو اس مکالمہ کی نوبت ہی کہاں آتی۔ صاف ثابت ہوا کہ نفسِ امّارہ کے علاوہ دُنیا میں کوئی چیز اور بھی ہے جو اسے گناہ کرنے پر اکساتی ہے اور جس کی پُرفریب دعوت پر وہ بسا اوقات بندگی کی بجائے سرکشی و نافرمانی کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔

ابلیس کون تھا؟

ابلیس کون سی مخلوق سے تعلّق رکھتا ہے؟ وہ فرشتہ ہے، انسان ہے یا کچھ اور؟ اس سلسلہ میں اگرچہ متقدمین نے بہت سی بحثیں کی ہیں اور یہ رائے رکھنے والے بھی بہت سے مُقدس و محترم وجُود ہیں کہ وہ فرشتوں میں تھا۔ لیکن جمہورِ اُمّت کا عقیدہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ وہ نہ انسان تھا نہ فرشتہ۔ بلکہ ایک اور مخلُوق سے تعلق رکھتا تھا جسے قرآن جِن کے نام سے یاد کرتا ہے۔

كَانَ مِنَ الْجِنِّ

وہ جِنّوں میں سے تھا۔

جِن عربی زبان میں جِنٌّ سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے پوشیدہ و خفیہ ہونا۔ یہ مخلُوق چونکہ ہمیں نظر نہیں آتی، ایک پوشیدہ مخلُوق ہے اِس لیے یہ جِن سے موسُوم ہُوئی۔ جن اہلِ علم نے یہاں جِن سے مُراد فرشتہ لیا ہے اس کی بنیاد بھی یہی پوشیدگی ہے۔ اُن کے نزدیک فرشتے چونکہ ہماری نظر سے پوشیدہ ہیں اس لیے اس اعتبار سے ان پر لفظِ جِن کا اطلاق ممکن ہے۔ لیکن یہ رائے قابلِ

قبول اِس لیے نہیں کہ اسے مان لینے کے بعد فرشتوں سے معصیت کا صدور ثابت ہوتا ہے جو ایک صاف اور واضح نصِ قرآنی کے منافی ہے۔

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْن

(وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جو کچھ انھیں حکم دیا جاتا ہے اُسے بجا لاتے ہیں۔)

حقیقتِ جن

عُلمائے سلف کے ہاں تو مسئلہ زیرِ بحث میں زیادہ سے زیادہ یہی ایک اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن مُتاخرین نے عقل کی رَو میں آکر سرے سے جن نام کی مخلوق ہی کا انکار کر دیا۔ شروع دَور میں سب سے پہلے معتزلہ میں سے نظامؒ نے جنّات کے وجُود کا انکار کیا۔ اور ہندوستان میں سب سے پہلے سرسیّد احمد خاں مرحوم اور ان کے ساتھیوں نے اس نظریہ کو اپنی تصنیفات میں جگہ دی۔ سرسیّد کے صاحبِ علم مگر تجدد پسند رفیق مولوی چراغ علی نے ایک کتاب لکھی ہے "تحقیقُ الجہاد"۔ اس کے صفحہ 37 تا 40 پر مسئلہ جن کی تشریح میں اُن کے قلم نے خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ قرآن نے جہاں حضورؐ کی خدمت میں جنوں کے ایک وفد کی آمد اور پھر اُن کے مُشرّف بہ اسلام ہونے

لہ یہ شخص لکھنے پڑھنے سے بالکل بے بہرہ تھا، لیکن اس کے باوجود مختلف علوم پر اسے کمال حاصل تھا۔ شعر بھی کہتا تھا اور اس کا یہ شعر تو آج تک نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔

ومرّ بقلبی خاطِرًا فجرحتہ ولم ار خلقا قط یجرحہ الفکر

جب میں نے اپنے دل میں اس کا تصوّر باندھا۔ اور اس کا گزر میرے دل سے ہوا تو وہ مجروح ہوگیا۔ میری نظر سے آج تک کوئی ایسی نازک شخصیت نہیں گزری جو مجرّد فکر و خیال ہی سے زخمی ہو جائے۔

کا ذکر کیا ہے مولوی صاحب نے وہاں تاویل یہ فرمائی ہے کہ یہ عرب بدوؤں کا ایک قبیلہ تھا جس نے نخلہ کے مقام پر اسلام قبول کیا۔ مگر اس خیال کی سند کیا ہے؟ مولوی صاحب قبلہ نے اس کے لیے کسی آیت اور کسی تاریخی حوالے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سرسید کے بعد مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور ان کی جماعت کے اہلِ علم کا نمبر آتا ہے۔ مثلاً مولوی محمد علی اپنی تصنیف بیان القرآن میں لکھتے ہیں

"جن سے مراد انسان ہی ہیں۔ چونکہ یہ باہر کے لوگ تھے جو اہلِ عرب کی نظر سے مخفی تھے اس لیے انھیں جن کہا گیا ہے اور یہ جن عیسائی تھے"[1]

مرزا بشیر الدین محمود نے اس سے بھی چند قدم بڑھ کر یہ نظریہ پیش کیا کہ جن دراصل CAVE - MAN (غاروں کے اندر چھپ کر رہنے والے) کو کہتے ہیں۔

"جب تک انسان غاروں میں رہا تو وہ جن نام کا مستحق تھا اور جب وہ سطحِ زمین پر آکر بسا تو وہ آدم اور انسان کہلانے لگا"[2]

جناب غلام احمد پرویز نے بھی کم و بیش اس موضوع پر انھی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"جن انسانوں کے وحشی قبائل کو کہا جاتا ہے۔ یہ صحراؤں اور جنگلوں میں رہتے تھے اور شہری لوگوں سے زیادہ طاقت ور اور ڈیل ڈول میں زیادہ قوی اور مضبوط تھے۔"[3]

ملاحظہ کیا آپ نے؟ نئی بات کہنے کے شوق میں یہ لوگ کہاں سے کہاں

---

[1] بیان القرآن از مولوی محمد علی لاہوری جلد نمبر 3 تفسیر سورۂ جن۔ [2] سیرِ روحانی جلد اول ص 61۔ [3] ابلیس و آدم از پرویز۔

جا پہنچے ؟ ہر ایک نے جن کی من مانی تاویل کی اور اُمّت میں وحدتِ فکر پیدا کرنے کی بجائے اس کو طرح طرح کی توجیہات کے چکّر میں ڈال دیا۔ کسی نے یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ قرآن کے سیاق وسباق، احادیث کے منشاء و مفہوم، آئمہ سلف کی تحقیقات پر بھی ایک نگاہِ غلط انداز ڈال لے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کی تاویلوں پر خود مرزا غلام احمد صاحب کا وہ تبصرہ صادق آتا ہے جو اُنھوں نے سرسیّد مرحوم کی تفسیر پر رائے دیتے ہُوئے سپُردِ قلم فرمایا تھا کہ :

" جو تاویلیں قرآنِ کریم کی نہ خداوند تعالیٰ کے علم میں تھیں نہ اس کے رسُولؐ کے علم میں، نہ صحابہ کے علم میں، نہ اولیاء اور قطبوں اور غوثوں کے علم میں اور نہ ان پر دلالۃ النص نہ اشارۃ النص، وہ سید صاحب کو سُوجھیں۔"

قرآن اور جن

مگر قرآن کہتا ہے کہ جن اور انسان دو مختلف قومیں ہیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

(ہم نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔)

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ انسان کو مٹی سے بنایا گیا اور جن کو آگ سے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (الرحمٰن)

(اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیپڑی کی طرح بجتی ہُوئی مٹی سے پیدا کیا اور بنایا جن کو آگ کی لپیٹ سے۔)

قرآن اس کی بھی شہادت دیتا ہے کہ جن انسانوں سے پہلے پیدا کیے گئے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ. (الحجر)

(ہم نے انسان کو سیاہ سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا۔ اور اس سے پہلے ہم نے جنوں کو لُو کی گرمی سے پیدا کیا تھا۔)

قرآن کہتا ہے کہ اہل عرب نے جنوں کو خدا کا شریک ٹھہرا رکھا تھا وَجَعَلُوْا شُرَكَآءَ الْجِنَّ " وہ اُن کی عبادت کرتے تھے۔ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ"۔ کیا پرویز صاحب اور مرزا بشیر الدین محمود صاحب کے نزدیک عرب اتنے ہی کم عقل اور احمق تھے کہ انھوں نے غاروں میں رہنے والے غیر متمدن و غیر مہذّب، وحشی و جنگلی قبیلوں کو معبود بنا رکھا تھا؟ کیا تاریخ میں کوئی ایسی نظیر موجود ہے کہ مہذّب انسانوں نے وحشی اور جنگلی آدمیوں کی پرستش کی ہو؟

اعتراض کیا گیا ہے کہ اگر جن موجود ہیں تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتے؟ الزامی جواب تو اس کا یہ ہے کہ اگر کسی چیز کا نظر نہ آنا ہی اس کے عدم وجود کی دلیل ہے تو سوچ لیجیے کہ اس کی زد ایمان بالغیب کے کتنے ہی مہتم بالشّان عقائد پر جا کے پڑتی ہے۔ خدا، فرشتہ، جنّت، دوزخ، ان حقائقِ ثابتہ کو کس نے دیکھا ہے؟ مگر کیا کوئی عقل مند یہ کہہ کر ان کا انکار کر سکتا ہے کہ جب تک یہ نظر نہ آئیں میں ان پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں؟ ان امورِ غیب کو بھی چھوڑیئے، یہ کششِ زمین یہ مقناطیسی قوّت، یہ اعراض کیا ان چیزوں کا آپ اس لیے انکار کر دیں گے کہ یہ آپ کو نظر نہیں آتیں؟ ہمارے خیال میں ان دانایانِ روزگار میں سے شاید ہی کوئی بزرگ اس کے لیے تیّار ہو سکے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ جنّات کے معاملے میں یہی روش اختیار کرتے ہوئے ان حضرات کو کسی قسم کا یک رُخا پن

محسوس نہیں ہوتا۔

اور ہم تو کہتے ہیں کہ یہ بات بھی کیوں تسلیم کی جائے کہ جن نظر نہیں آتے؟ کیا ماضی و حال میں متعدد شہادتیں اس امر کی موجود نہیں کہ دیکھنے والوں نے جنوں کو دیکھا! یہی نہیں بہت سوں نے انھیں ماتحت بنا کر طرح طرح کے کام لیے امام ابن تیمیہؒ سے کسی کو فکر و نظر میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ لیکن ان کی سیرت پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ ان کے دشمن بھی اعتراف کرتے ہیں کہ وہ نہایت کھرے آدمی تھے۔ جھوٹ کے قریب تک پھٹکنے کا اُن سے خدشہ نہیں۔

امام صاحب اپنی مشہور کتاب النبوات میں جنات کی کیفیت و ماہیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنات جن لوگوں کے ماتحت و مسخر ہو جائیں تو انھیں اپنی پیٹھ پر سوار کرا کے ہوا میں دور دور تک سیر کراتے ہیں۔ امام صاحب کے نزدیک یہ بات مشہورِ عام کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

وھذا امرٌ کثیرٌ معروفٌ وقد رأینا من ذالک مایطول وصفھا وقد ضربنا نحن من الشیاطین فی الانس ماشاء اللہ حتّٰی خرجوا من الانس ولم یعاودوہ [1]

"ایسے بہت سے واقعات ہیں جو جانے بوجھے ہیں اور خود ہم نے اس سلسلے میں اتنے واقعات دیکھے ہیں کہ ان کا تذکرہ طولِ بیان کا باعث ہوگا۔ اور انسانوں میں گھسے ہوئے شیطانوں کو تو خود ہم نے مارا ہے یہاں تک کہ وہ شیطان اس انسان سے اس طرح نکل بھاگا کہ پھر واپس نہیں آیا۔"

یہی شیخ ابوالعباس ابنِ تیمیہؒ ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

لم یخالف احد من طوائف المسلمین فی وجود الجن

---

[1] کتاب النبوات ص 265

وجمهور طوائف الكفار على اثبات الجن اما اهل الكتاب من اليهود والنصارى انهم مقرون بهم كاقرار المسلمين [1]

"عامۃ المسلمین اور کفار میں سے کسی نے جنوں کے وجود سے اختلاف نہیں کیا یہاں تک کہ اہلِ کتاب کو بھی مسلمانوں کی مانند اُن کے وجود کا اقرار ہے۔

بعض کتابوں میں جہمیہ اور معتزلہ کے بعض افراد کا اختلاف ضرور منقول ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ان فرقوں کی حیثیت مسلمانوں میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں رہی آج ان کے عقائد صرف کتابوں ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں عالمِ اسلام میں کہیں بھی ان معتقدات کے لوگ آباد نہیں جمہور اُمت کو شروع سے محدثین اور فقہائے عظام پر اعتقاد چلا آرہا ہے۔ اگر آپ ان حضرات کی وہ بحثیں اُٹھا کر دیکھیں جو انھوں نے معاملاتِ جن سے متعلق کی ہیں تو آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ وجودِ جن کے انکار و اثبات کا کیا سوال، وہاں تو جنوں اور انسانوں کے باہمی رشتے ناطے تک معرضِ بحث میں آئے ہیں صاحب آکام المرجان علامہ قاضی بدرالدین نے اپنی شہرہ آفاق کتاب میں "فی بیان مناکحۃ الجن" کے نام سے ایک باقاعدہ باب قائم کرتے ہوئے لکھا ہے۔

وهذا الباب فی بيان المناكحة بين الانس والجن۔ والكلام هنا فی مقامين (احدهما) فی بيان امكان ذالك ووقوعه (والثانی) فی بيان مشروعيته اما الاول فنقول نكاح الانسی الجنه وعكسه ممكن۔

"اور یہ باب انسان اور جن کے مابین نکاح سے متعلق ہے اور یہاں گفتگو دو پہلوؤں سے ہوگی۔ اول یہ کہ کیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے اور دوم یہ کہ اس سلسلے میں

---

[1] آکام المرجان ص 6

شریعت کا کیا حکم ہے تو جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے ہم عرض کریں گے کہ کسی انسان کا جنیّہ سے یا کسی جن کا اولادِ آدم میں سے کسی عورت کے ساتھ رشتۂ ازدواج عین ممکن ہے۔"

اس کے بعد اس مسئلہ کے عدمِ امکان کی مختلف دلیلوں کا رد کرتے ہوئے اور مختلف واقعات و امثلہ کو بطورِ ثبوت پیش کرتے ہوئے وہ اس کی مشروعیت کا فیصلہ سناتے ہیں کہ حضور نبی کریمؐ نے جن اور انسان کے درمیان اس طرح کا رشتہ قائم کرنے کی ممانعت فرمائی ہے اور تابعین میں سے ایک جماعت اسے مکروہ تصور کرتی ہے۔

اسی پر بس نہیں ہمارے فقہاء کے درمیان یہ بحث بھی پیدا ہوئی ہے کہ جنوں کو ان کے نیک اعمال پر ثواب اور برے اعمال پر عذاب دیا جائے گا یا نہیں؟ اور اور اس بحث میں حصہ لینے والے اصحاب میں امام ابوحنیفہ، ابن ابی لیلی، امام مالک امام اوزاعی، امام ابو یوسف، امام محمد، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور ابنِ حزم جیسے اکابر کے نام شامل ہیں۔

اکابر تابعین اور علماء کے ہاں یہ مسئلہ پر زیرِ بحث آیا ہے کہ

هل تصح الصلوٰة خلف الجن کیا جن کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے؟

ہماری کتبِ فقہ میں جنوں سے متعلق معاملات و مباحث کی فہرست تو بہت طویل ہے۔ انھیں دو چار موضوعات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمارے سلف میں تمام ائمہ و اکابر نہ صرف یہ کہ وجودِ جن کے قائل تھے بلکہ انھوں نے تجربات و مشاہدات اور کسی حد تک ضروریات کی بناء پر زندگی کے بہت سے گوشوں میں قومِ جن کے متعلق استخراج و استنباط سے بھی کام لیا ہے۔ اگر آج بعض اصحاب کا یہ دعویٰ قبول کر لیا جائے کہ قرآن میں "قومِ جن" سے مراد بعض وحشی و جنگلی قبائل اور بعض

CAVE MEN تھے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ چودہ صدیوں میں قرآن حکیم کے معانی و مطالب آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آسکے تھے اور اب پہلی مرتبہ ان کا القا اس صدی کے بعض مفسرین کے قلوب باصفا پر ہوا ہے اس مفروضہ کو صحیح تسلیم کرنے کے بعد کیا قرآن کی حیثیت العیاذ باللہ ایک چیستان سے زیادہ نہیں رہ جاتی اور کیا اس کے بعد کوئی بھی مسلمان عہدِ نبوی سے تواتر کے ساتھ منتقل ہونے والے عقائد پر شرح صدر کے ساتھ مطمئن ہو سکتا ہے؟

قرآن حکیم میں قومِ جن کا تذکرہ جن جن مقامات پر آیا ہے ان میں سے وہ مقام خاص طور پر قابلِ غور ہے جہاں سود کھانے والوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبٰوا لَا يَقُومُونَ اِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ [1]

(جو لوگ سود کھاتے رہتے ہیں کھڑے نہ ہو سکیں گے۔ سوائے اس کے کہ جیسے وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے جنون سے خبطی کر دیا ہو۔)

بعض حضرات نے کہا ہے اہلِ عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جنون عموماً جن کے چمٹ جانے سے ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن نے سود خور آدمی کی کیفیت و ذہنیت کا نقشہ کھینچا تو اس عقیدۂ متعارفہ کو دہرا دیا تاکہ مخاطبین بھیانک سے بھیانک منظر کا تصوّر کر سکیں۔ ہمارے نزدیک مندرجہ بالا آیت کا یہ مفہوم متعدد وجوہ سے صحیح نہیں۔

۱:۔ قرآنِ حکیم نے مسِ شیطانی سے مجنون و مصروع ہونے کا یہ اظہار خواہ مشرکین عرب کے عقیدۂ متعارفہ کے تحت ہی کیوں نہ کیا ہو لیکن اس نے

---

[1] سورۃ البقرۃ آیت نمبر 275

سیاق وسباق میں ایک لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کیا جس سے اس عقیدہ کی تغلیط ہوتی ہو۔ اس لیے قرآن کا من وعن اس بات کو دہرا دینا ہی اس کی صحت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

2:۔ اگر یہ بات جہلا کے خود ساختہ اور مذعومہ عقائد سے تعلق رکھتی تھی جیسا کہ کہا گیا ہے۔

"یضیفون الناس الصرع الی الشیطان و الیٰ الجن"

(لوگ جنون کو شیطان اور جن سے منسوب کرتے تھے) تو قرآن کا فرض تھا کہ وہ اس مذعومہ عقیدہ کی تردید کرتا۔ قرآن مذعومات کے بطلان کے لیے آیا ہے۔ اس سے ایسے اندازِ بیان کی کبھی توقع نہیں کی جا سکتی جس سے ایک جاہلانہ تخیل کو تقویت ملے۔

3:۔ اس آیت کے آگے پیچھے کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ قرآن جو بات کہہ رہا ہے وہ محض تمہارے تصورات کے پیش نظر کہہ رہا ہے۔

4:۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسِ شیطانی سے مبتلائے تکلیف و مصیبت ہونے کا تصور صرف اہلِ عرب ہی میں نہیں پایا جاتا تھا۔ بلکہ بعض برگزیدہ پیغمبر بھی یہی سمجھتے تھے۔ قرآن نے حضرت ایوب علیہ السلام کی زبان سے ان کی بیماری کے متعلق یہ کہلایا ہے کہ رب انی مسنی الشیطن بنصب و عذاب

5:۔ بعض جلیل القدر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے اسی عقیدہ کی توثیق کی ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی صاحبِ تفسیر مظہری کہتے ہیں:

یعنی عرضه الجنون وفساد العقل بمس الشیطان وخبطه والمرض والصرع والجنون قد یحصل بمس الشیطان فلا یحتاج ذالك انی ما قیل انه وارد علی ما یزعمون ان الشیطان یخبط الانسان

فإن حدوث المرض بمس الشيطان ثابت بالكتاب والسنة [1]

حضرت امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والدِ ماجد سے عرض کیا بعض لوگ کہتے ہیں کہ جن انسان کے جسم میں داخل نہیں ہوتا فرمایا " یَابُنی یَکذِبُونَ " اے بیٹے وہ جھوٹ کہتے ہیں۔

وذکر ابو الحسن الاشعری فی مقالات اهل السنة والجماعة انهم یقولون ان الجن ندخل فی بدن المصروع کما قال الله تعالیٰ الذین یاکلون الربوٰ - الیٰ اخره (حوالہ ایضاً)

(ابوالحسن الاشعری نے اہلِ سُنّت والجماعت کے عقائد کے باب میں ذکر کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جن مصروع کے بدن میں داخل ہوتا ہے۔ جیساکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " الّذِین یَاکلون الربوٰ "

ابوداؤد کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت حضورؐ کے پاس اپنے بچے کو لے کر آئی اور اس نے عرض کیا کہ یارسُولؐ اللہ! اسے جنون ہوگیا ہے آپؐ نے بچے کا سینہ چھُوا اور فرمایا۔

اخرج یاعدو الله فانی رسُول الله صلی الله علیه وآله وسلم

"اے دُشمنِ خُدا نکل باہر ہو کہ میں اللہ کا رسُولؐ ہُوں"

جن انسان کے بدن میں داخل ہوکر اسے قابُو میں کرلیتا ہے اور اسے عاجز و لاچار بنا دیتا ہے یہ ایک ایسی بدیہی بات ہے کہ اس پر ان نظریاتی دلائل کے علاوہ روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ کو بھی دال بنایا جاسکتا ہے۔ ہماشما کا ذِکر نہیں اُمّت کے گلہائے سرسبد اور مایہ ناز علماء و صالحین نے اپنے تذکروں میں ایسے بے شمار واقعات

---

[1] تفسیر مظہری ج ۱ ص 394

درج کیے ہیں جن میں جنوں کا انسانی بدن میں داخل ہونا اور پھر کلام الٰہی کے زور سے ان کا نکل بھاگنا روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ خود اس دور میں مجھ سے ملک کے ایک مایہ ناز عالم دین اور عابد وزاہد بزرگ نے بیان کیا کہ ان کی بیوی کئی سال تک بیمار رہیں۔ اچانک بیٹھے بٹھائے دورہ پڑتا اور وہ بے ہوش ہوجاتیں بہت علاج معالجہ کرایا مگر بے سود۔ آخر کار کسی کے مشورے پر ماہرینِ جن سے رجوع کیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ یہ ایک جن کی کارستانی ہے۔ اس کے بعد جب کبھی دورہ پڑتا میں کلامِ پاک پڑھنا شروع کر دیتا اور اس کے اثر سے وہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہوجاتیں۔ ان کے بے ہوشی کے عالم میں اکثر جن سے ہمکلام ہونے کا موقع بھی ملا۔ قصیدہ بردہ اُسے خوب یاد تھا۔ فرفر سُناتا۔ حالانکہ میری بیوی یقیناً قصیدہ بردہ سے ناواقف تھی۔ ایک مرتبہ میں نے جن سے اس کے وجود کا ثبوت چاہا تو چند لمحول کے اندر میری گود میں تر و تازہ شاخ سمیت ایک الائچی آگری۔

یہ ایک شہادت نہیں آج بھی بیسیوں دوسری ثقہ شہادتیں آپ کو اسی عہد میں تحقیق کرنے سے مل سکتی ہیں۔ اس کے بعد فرمایئے کہ آپ کے لیے اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر کیا چارہ ہے؟

اب رہا یہ سوال کہ ایسی صورت میں جنوں کے شر سے بچنے کا کیا طریقہ ہے؟ تو تو کتاب و سُنّت سے اس کی جو چند تدابیر معلوم ہوئی ہیں وہ یہ ہیں۔

ا۔ سب سے پہلی تدبیر اللہ تعالےٰ کی پناہ چاہنا ہے۔ خود اللہ تبارک تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وما ینزغنك من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ انہ ھو السمیع العلیم

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اکثر "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھتے رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔

2۔ معوذتین کا بیش از بیش ورد (پارہ عم کی وہ آخری سورتیں جو قُل اَعُوذُ سے شروع ہوتی ہیں۔)

3۔ آیت الکرسی کی تلاوت۔

4۔ سورۃ بقر کے فضائل میں بھی یہی مذکور ہے۔ حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا تجعلو بیوتکم قبورًا دان البیت الذی تقراء فیہ البقرۃ لایقربہ الشیطان

(اپنے گھروں کو قبریں مت بناؤ۔ وہ گھر جس میں سورۃ بقرہ پڑھی جاتی ہے شیطان اس کے قریب نہیں پھٹکتا۔)

5۔ سورۃ حم، المومن کے شروع سے لے کر الیہ المصیر تک آیت الکرسی کے ساتھ پڑھنا۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی یہ آیات رات کو سوتے وقت پڑھے تو اللہ تعالیٰ صبح تک اسے اپنے حفظ و امان میں رکھتا ہے اور جو کوئی صبح کے وقت اسے پڑھے تو وہ سوتے وقت تک اللہ تعالیٰ کی پناہ میں رہتا ہے۔

6۔ سو مرتبہ اس کلمہ کا ورد رکھنا " لا الہ اِلا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ لہٗ الملکُ و لہ الحمدُ وھو علی کُلِ شئٍ قدیر۔

حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت میں اس کا بھی یہی اثر بیان ہوا ہے۔

7۔ ذکر اللہ کی کثرت۔

8۔ " الوضو والصلوۃ " شیاطین اور جن آگ سے پیدا ہوتے ہیں اور آگ کو پانی ہی بجھا سکتا ہے۔ اسی لیے حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے

ان العضب من الشیطان و ان الشیطان من النار و انما تطفی النار بالماء فاذا غضب احمدکم فلیتوضئوا

غیظ و غضب شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے ہے اور آگ پانی سے بجھائی جا سکتی ہے تو جس کسی کو تم میں سے غصہ آجائے اُسے چاہیے کہ وضو کر لے۔

ان تدابیر کا خلاصہ شیخ الاسلام امام تیمیہؒ نے بدیں الفاظ ارشاد فرمایا :

فأهل الاخلاص و الايمان لا سلطان له عليهم ولهذا يهربون من البيت الذى تقراء فيه سورة البقرة و يهربون من قراة آية الكرسى و آخر سورة البقر وغير ذالك من قوارع القرآن[1]

(رہے اہل اخلاص و ایمان تو ان پر ان کا غلبہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے (جن اور اور شیاطین) اس گھر سے بھاگ جاتے ہیں جہاں سورہ بقرہ پڑھی جائے اور یہ آیت الکرسی اور سورہ بقر کی آخری آیتوں اور دوسرے قوارع القرآن کی تلاوت سے بھی راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔)

میں جواب کو ختم کرتے ہوئے ایک بار پھر عرض کروں گا کہ جہاں تک جن بھاگنے کے فن کا تعلق ہے، مجھے ذرّہ برابر بھی اس کی شُد بُد نہیں۔ لیکن قرآن اور حدیث کے حقیر سے مطالعہ کے بعد اتنا ضرور جانتا ہوں کہ شیاطینِ جن اور شیاطینِ انس دونوں سے بچنے کا طریقہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ آدمی شریعتِ الٰہیہ کے مطابق زندگی گزارے اور اس کے سایۂ دامان میں آکر پناہ لے کہ جس سے بڑی پناہ گاہ کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے قرآن میں حضرت سلیمان کے قصے میں پڑھا ہوگا کہ اللہ تعالےٰ نے جن بھی ان کی ماتحتی میں دے رکھے تھے وہ مقام و منصب نہ سہی لیکن خدا کی قسم! اگر آج بھی کوئی شخص اسلام کے بتائے ہوئے معیار و مطلوب کے مطابق اپنی زندگی بنائے تو جنوں کے ہاتھوں ستائے جانے کا تو کیا سوال شیاطین جن اُسے آتا دیکھ کر راستہ بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔ یہی امام ابنِ تیمیہؒ لکھتے ہیں اور اسی پر گفتگو ختم کرتا ہوں کہ :-

---

[1] النبوات ص 264

من یکون اخبارہ من الشیاطین تخبزہٗ لا یکاشف اھل الایمان والتوحید واھل القلوب المنورۃ بنور اللہ بل یھرب منھم یعترف انہ لا یکاشف ھؤلاء وامثالھم[1]

(شیاطینِ جن جو اپنے پر قابو یافتہ لوگوں کو دُوسروں کی خبریں پہنچاتے ہیں اعتراف کرتے ہیں کہ اہل ایمان و توحید اور ارباب صفا کے احوال سے وہ کبھی باخبر نہیں ہو پاتے ہیں بلکہ ان سے تو انھیں بھاگتے ہی بن پڑتی ہے۔)

ابلیس کو سجدے کا حکم

باقی رہی یہ بات کہ کیا ابلیس کو بھی حضرتِ آدم علیہ السّلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حُکم دیا گیا تھا؟ اس سلسلہ میں بہت سے لوگوں سے اکثر یہ سننے میں آیا ہے کہ آیاتِ قرآنی میں تو سجدے کا حُکم صرف فرشتوں کے نام ہے پھر یہ ابلیس کے انکار اور اس کے راندۂ درگاہ ہونے کی نوبت کیوں آئی؟ یہ سوال عام طور پر وہ لوگ کرتے ہیں جن کی نظر میں قُرآنِ حکیم کی تمام متعلقہ آیات نہیں ہوتیں۔ وہ جب سُورۂ بقر کی ان مشہور و معرُوف آیات میں حُکمِ سجدہ کا مذکور نہیں پاتے تو ان کے ذہن میں طرح طرح کے اعتراضات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ حالانکہ اگر قرآنِ حکیم کے وہ تمام مقامات ذہن میں مستحضر ہوں جہاں قصّۂ آدم و ابلیس کا کوئی نہ کوئی پہلو بیان کیا گیا ہے تو سرے سے کوئی اشکال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم کی ایک دُوسری سُورہ "ص" میں صاف ارشاد ہے کہ حقِ تعالےٰ نے ابلیس کو بھی سجدے کا حُکم دیا تھا۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ

---

[1] ایضاً ص 265

(اے ابلیس! تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا۔ جب کہ میں نے تجھے اس کا حکم دیا تھا۔)

اس صراحت کے بعد تو کسی مزید بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اگر بفرضِ مُحال یہ تصریح نہ بھی ہوتی تب بھی مسئلہ کچھ اتنا اُلجھا ہُوا اور پیچیدہ نہ تھا۔ فرشتے ابلیس سے افضل ہیں۔ جب انھیں سجدہ کرنے کا حکم دیا جا رہا تھا تو جنوں کی غیر افضل مخلوق تو بدرجہ اَولیٰ اس حُکم کی مُخاطب تھی۔ بادشاہ اپنے کسی وزیر کے نام کوئی حکم جاری کرتا ہے تو وزیر کا ماتحت عملہ تو آپ سے آپ اس کی بجا آوری کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔

اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ

جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے سوال کیا کہ تُو نے میرے حکم کے باوجُود آدمؑ کو سجدہ کیوں نہیں کیا تو قرآن کہتا ہے اس کا جواب یہ تھا۔

اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ

(میں اس سے بہتر ہُوں تُو نے مُجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُسے مٹّی سے۔)

ابلیس نے اپنی برتری کے لیے جو دلیل پیش کی وہ کہاں تک صحیح ہے اس پر تو ہم آگے چل کر غور کریں گے۔ لیکن یہاں اتنا اور سنتے جائیے کہ خوارج میں بھی بعض لوگ ابلیس کے اس موقف کو بہت معقُول اور وزنی قرار دیتے تھے "کتاب الکامل للمبرد" میں ہے کہ بشار بن بُرد کے نزدیک ابلیس نے ٹھیک کیا کہ آدم کو سجدہ نہ کیا۔

یُصَوِّبُ رأی ابلیس فی امتناعه من السجودِ لادم

یہ شعر بھی اسی کا بیان کیا گیا ہے۔

الارضُ مظلمةٌ والنارُ مشرقةٌ وَالنَّارُ معبُودةٌ مذ کانتِ النَّار

(مٹی تاریک ہے اور آگ روشن اور آگ کی عبادت کی جاتی رہی ہے جب سے کہ وہ موجود ہے۔)

حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب بدائع الفوائد میں ابلیس کی اس دلیل کا جائزہ لیا ہے کہ آگ مٹی سے بہتر ہے۔ حافظ صاحب نے اس دعوے کی تردید میں متعدد دلائل پیش کیے ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

ا۔ آگ مفسد و مہلک ہے جلانا اس کا خاصہ ہے۔ لیکن مٹی میں یہ خرابی نہیں پائی جاتی۔

2۔ آگ میں غصہ و گرمی کی کیفیت ہے اور اس کے برعکس مٹی میں وقار و سکون و ثبات ہے۔

3۔ زمین میں انسانوں اور حیوانوں کا رزق ہے اسی سے ہم اپنی پوشش و زینت کا سامان کرتے ہیں لیکن آگ میں یہ فوائد نہیں پائے جاتے۔

4۔ مٹی سے کوئی انسان اور حیوان بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک اسی کا ضرورت مند رہتا ہے، بخلاف آگ کے کہ حیوانات کو تو اس کی حاجت ہی نہیں۔ انسان بھی بعض اوقات اس سے بالکل مستغنی ہو جاتا ہے

5۔ آگ میں کوئی بیج ڈال کر دیکھئے۔ وہ اسے جلا کر راکھ بنا دے گی، مگر مٹی میں ڈالیے تو وہ اُسے خوب نشو و نما دے کر اور کئی گنا بڑھوتری دے کر واپس لوٹاتی ہے۔

6۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے بار بار زمین کے فوائد بیان فرمائے ہیں اسی میں آدمی زندگی گزارتا ہے اور پھر اسی میں دفن ہوتا ہے۔ لیکن ایک دو آیات کے سوا پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بطور عذاب اور

عقوبت آگ کا ذکر فرمایا ہے۔

7۔ زمین پر مساجد ہیں۔ خود خانہ کعبہ جیسا مقدس گھر ہے مگر آگ اس شرف سے یکسر محروم ہے۔

8۔ آگ خادم ہے اور زمین مخدوم۔ ضرورت پڑتی ہے تو آگ سلگا لی جاتی ہے۔ اور جب آگ اس خدمت سے فارغ ہو چکتی ہے تو اُسے بجھا دیا جاتا ہے۔

آگ اور مٹی کے اس مُناظرہ میں امام ابنِ قیمؒ نے جو محکم دلائل پیش کیے ہیں اُن سے آپ یقیناً محظوظ ہوتے ہوں گے۔ لیکن آیئے ذرا یہ بھی معلوم کرتے چلیں کہ ابلیس کی اس دلیل کا خود خداوند عالی جناب نے کیا جواب دیا۔ قرآن کہتا ہے اس کے جواب میں اللہ تبارک تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

فَاخْرُجْ مِنْهَا ، فَإِنَّكَ رَجِيمٌ

(اِس سے نکل جا تو راندۂ درگاہ ہے)

یہ کیا؟ نہ تو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی دلیل کو رد کیا۔ نہ اس کے دعوے پر تبصرہ فرمایا۔ بس ایک دم سے حکم جاری کر دیا کہ ہمارے دربارِ عالی سے نکل جاؤ۔ کیا کوئی شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ العیاذ باللہ اللہ تعالیٰ سے ابلیس کی دلیل کا جواب نہ بن آیا ہو گا۔ اس لیے اِس نے اس جلال کا مُظاہرہ کیا؟ ہرگز نہیں۔ پھر اس جواب کی حکمت کیا ہے؟ آپ غور کریں گے تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس میں ہمارے لیے ایک بہت بڑی تعلیم کا سامان پنہاں ہے۔ سکھایا یہ گیا کہ لغو اور فضول باتوں کا کچھ نوٹس نہیں لینا چاہیئے جہاں بات سمجھنے کی نیّت نہ ہو۔ نرے دعوے ہی دعوے ہوں وہاں بحث میں ہرگز نہیں الجھنا چاہیے۔ یہ بھی بتا دیا گیا کہ احکام الٰہی کے مُقابلے میں جو لوگ اپنی عقل پر بھروسہ کرتے ہیں اور دین و شریعت کی تردید میں منطق چھانٹتے ہیں ان

کی دانشوری ملعُون دانشوری ہے اور وہ اس قابل نہیں کہ اسے احترام و اکرام کی نظر سے دیکھا جائے۔ مولانا رُومؒ نے خُوب کہا ہے ؎

مے شناسد ہر کہ از سر محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

عطائے مُہلت کا فلسفہ

اس عتاب و قہر کے بعد چاہیئے تو یہ تھا کہ ابلیس سنبھل جاتا۔ اپنی غلطی کا احساس کر کے اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس کے برعکس ہُوا یہ کہ وہ اور تن گیا اس نے قیامت تک کے لیے مہلت طلب کی تاکہ افرادِ نسلِ انسانی کو گُم راہ کر سکے۔

قَالَ رَبِّ فَانْظُرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ

اور جب یہ مُہلت دے دی گئی تو ظالم نے کس شان سے قسم کھائی۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ

(آپ کی عزت کی قسم میں ان سب کو گُم راہ بنا کے رکھ دُوں گا۔)

عقیدۂ رسالت کے بغیر مُجرّد توحید ہی اگر نجات کے لیے کافی ہوتی تو ابلیس شاید سب سے پہلے جنّت میں داخل ہوتا کہ ایک تو اس نے خُدا کے علاوہ کسی کو سجدہ نہیں کیا۔ اور دُوسرے یہ کہ راندۂ درگاہ ہو چکنے کے باوجُود قسم بھی کھاتا ہے تو خُدائے بزرگ و برتر کی، لیکن ہوا کیا۔ نبی کی اطاعت کا انکار کرنے پر اس کی عُمر بھر کی عبادت و ریاضت پر پانی پھر گیا۔ اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رحمت و مغفرت سے محرُوم کر دیا گیا۔ خیر یہ تو ایک جُملہ معترضہ تھا۔ بات عطائے مہلت کی ہو رہی تھی۔ غور ہمیں اس بات پر کرنا ہے کہ ابلیس کے کھلم کھُلا چیلنج سماعت فرمانے کے بعد بھی

حضرتِ باری نے ابلیس کو مہلت عطا کیوں فرمائی؟

مسئلہ کا ایک پہلو تو خدائے رحیم و کریم کی شانِ جود و سخا سے متعلق ہے۔ عمر بھر جس نوکر نے ہماری خدمت کی ہو سزاوار قہر و غضب ہو جانے کے بعد اگر وہ کچھ دن مزید ہمارے ہی ہاں مقیم رہنے کی اجازت مانگ رہا ہو تو کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ہم درخواست سُنی ان سنی کر کے اس کا بوریا بستر فی الفور باہر گلی میں پھنکوا دیں۔ یہ بات ہمیں کچھ اپنی شرافت و سخاوت سے ہٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسی مثال کو سامنے رکھ کر اب ذرا ابلیس کے معاملے پر غور فرمایئے۔ جب ہم بندوں کا حال یہ ہے تو اس مالکِ حقیقی کے لیے یہ بات کس طرح پسندیدہ ہو گی کہ جس نے سالہا سال عبادت کی تھی اپنے دربار سے نکالتے وقت اس کی آخری تمنّا بھی پوری نہ کرے۔

لیکن اگر آپ اس سے بھی زیادہ گہرائی میں جانے کے خواہش مند ہوں تو ہم عرض کریں گے کہ اس مہلت بخشی سے مقصود حضرتِ انسان کی آزمائش ہے رات کا اندھیرا نہ ہو تو دن کے اُجالے کی قدر کہاں باقی رہے؟ خزاں کا موسم نہ ہو تو بہار کی جلوہ پاشیوں کا کیا مزہ؟ دُکھ نہ ہوں تو سُکھ کا لُطف کیسے آئے گا؟ اضداد کے وجود ہی سے کائنات کی رونق ہے۔ گناہ نہ ہوں تو نیکی نیکی کہلانے کی مستحق نہ ٹھہرے۔ اور شر نہ ہو تو خیر کا تعین و تشخص ہمارے لیے مشکل ہو جائے راستے کی رکاوٹیں رہزن نہیں ہوتیں راہبر ہوتی ہیں اور یہ ہمیشہ ہمّتِ عالی پر مہمیز کا کام دیتی ہیں ؎

تجھ سا کوئی رہبر نہیں اے دُوریٔ منزل
احسان ترا ہم نے بہر گام لیا ہے

مشہور صُوفی شاعر حضرت اصغر گونڈوی نے بھی خُوب کہا ہے ؎

چلا جاتا ہُوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جاتے

کش مکش اور تقابل کی نوبت نہ آئے تو بہت سی صلاحیتیں سوئی رہتی ہیں انسان کے جوہر نہیں کھلتے۔ یہی تعلیم علامہ اقبال مرحوم نے بھی پیش کی ہے مثنوی اسرار و رموز میں انھوں نے حضرت علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک نوجوان ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے اپنے دشمنوں کے جور و ستم کا شکوہ کیا اور درخواست کی کہ وہ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اُسے کوئی نصیحت فرمائیں۔ سیّد ہجویری نے اس موقعہ پر جو کچھ ارشاد فرمایا اقبالؒ نے اسے نظم کے پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ نے کہا۔

فارغ از اندیشۂ اغیار شو
قوّتِ خوابیدۂ بیدار شو

دُشمنوں کے خوف سے بے نیاز ہو جا۔ تو ایک سوئی ہوئی طاقت ہے تجھے بیدار ہونا چاہیے۔

با عزیزاں سرگراں بودن چرا
شکوہ سنجِ دُشمناں بودن چرا

عزیزوں سے خفا ہونے اور دشمنوں کی شکایت کرنے سے کیا حاصل۔

راست مے گویم عدو ہم یارِ تُست
ہستیٔ او رونقِ بازارِ تست

میں تجھ سے سچ کہتا ہُوں کہ دُشمن بھی درحقیقت تیرا دوست ہے، اسی کے وجود سے تیرے بازار کی رونق قائم ہے۔

ہر کہ دانائے مقاماتِ خودی است

فضلِ حق داند اگر دُشمن قوی است

وہ شخص کہ جو مقاماتِ خودی سے آگاہ ہے قوی دُشمن کو اپنے لیے اللہ کی رحمت تصوّر کرتا ہے۔

اُوپر کی حکایت میں حضرت علی ہجویریؒ نے دشمن قوی کو اللہ کے فضل سے تعبیر کیا اور یہ کچھ غلط نہیں ہوگا۔ اگر ہم اس کی روشنی میں ابلیس کی مہلتِ کار کو انسانیت کے حق میں رحمت قرار دیں۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ حضور نبی کریم اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوتے ہم اپنے اپنے شیطان کو مشرف بہ اسلام کر لیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ "یا رسولُ اللہ! کیا ہر انسان کے ساتھ شیطان لگا ہوا ہے؟" حضورؐ نے فرمایا "ہاں"۔ انھوں نے پوچھا "کیا آپ کے ساتھ بھی؟" آپ نے جواب دیا "ہاں" "ولٰکن ربی اعاننی علیہ حتیٰ اسلم"

اقبال نے غالباً ان اشعار میں اسی حدیث کی ترجمانی کی ہے

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زآنکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

نظریۂ جبریّت

قیامت تک کی مہلت مل جانے کے بعد ابلیس نے چیلنج کیا کہ اب میں انسانوں کو بے راہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ اور تو دیکھے گا کہ ان میں سے اکثر تیرے ناشکر گزار ہیں۔ مگر اس چیلنج کا باعث اس نے جس چیز کو

قرار دیا وہ حد درجہ عجیب وغریب تھی کہا یہ سارا اس لیے کروں گا کہ

فَبِمَا اَغْوَيْتَنِيْ

(چونکہ تُو نے مجھے گمراہ کیا۔)

گویا اس نے اپنی ساری غلطی کا بوجھ حق تعالیٰ کی مشیّت پر ڈال دیا اور یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کی کہ آپ کو منظور ہی یہی تھا کہ میں گمراہ ہو جاؤں اس کفر و سرکشی میں میرا اختیار ہی کب شامل تھا۔ جبریہ کی گمراہ جماعت تو آج سے چند صدیاں پیشتر وجود میں آئی تھی۔ لیکن دیکھا جائے تو نظریۂ جبریت بہت پرانا ہے اور اس کی نشر و اشاعت کا آغاز خود حضرتِ ابلیس کے وجود بے بہود سے ہوا ابلیس کے اس عذر لنگ سے ان لوگوں کو عبرت پکڑنی چاہیئے۔ جو آج بھی انسانی اختیارات کی نفی کرتے ہوئے اپنی جملہ مصیبتوں کا ذمہ دار خود منشائے خداوندی کو قرار دیتے ہیں۔ اقبال مرحوم نے حقِ تعالیٰ اور ابلیس کے اس مکالمہ کو بہت ہی عمدگی سے نظم کیا ہے۔

ابلیس

اے خدائے کُن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ وہ زندانیٔ نزدیک و دور و دیر و زود
حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود

خدا

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجّت اُسے
کہتا ہے تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام

ظالم اپنے شعلۂ پیچاں کو خود کہتا ہے دُود

نتائج و عبر

ابلیس نے آدم کو سجدہ نہ کیا۔ قصّۂ آدم و ابلیس میں ہمارے لیے جو عبرتیں اور موعظتیں پوشیدہ ہیں ان میں سے بعض کی طرف ہم گزشتہ صفحات میں اشارہ کر چکے ہیں کچھ کا تذکرہ ہم یہاں کر رہے ہیں۔

۱۔ ابلیس سے جو نافرمانی سرزد ہوئی اس کا بنیادی محرک اس کا جذبۂ حسد تھا آدم کی برتری دیکھ کر اس کے سینے میں بغض و عناد کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ حکمِ خداوندی کے باوجود وہ اس کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہوا۔ اور فضیلتِ آدم کو باطل ثابت کرنے کے لیے اس نے ذُرّیتِ آدم کو گمراہ کرنے کا تہیّہ کر لیا بقول مولانا رُوم۔

زآنکہ ہر بدبخت خرمن سوختہ
می نخواہد شمع کس افروختہ

(کیونکہ اپنے خرمن کو نذرِ آتش کرنے کے بعد ہر بدبخت یہ چاہتا ہے کہ کسی اور کے ہاں بھی کوئی شمع نہ جلنے پائے۔)

اندازہ فرمایئے حسد بظاہر کتنی معمولی برائی ہے۔ لیکن نتائج کے اعتبار سے یہی ایک بات شیطان کی سالہا سال کی عبادت و ریاضت پر پانی پھیر گئی قصّۂ آدم و ابلیس کا یہ سبق نگاہ میں ہو تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی وہ حدیث سمجھ میں آتی ہے جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

اِیَّاکُمْ وَ الْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ [1]

[1] ابو داؤد

(حسد سے بچو اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ ایندھن کو کھا لیتی ہے۔)

2۔ قرآنِ حکیم نے شیطان اعظم کو ابلیس (مایوس) کہہ کر ایک اور اہم حقیقت کی طرف رہنمائی کی اور وہ یہ کہ انسان کو کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے آج بھی بہت سے لوگ عبادت و ریاضت کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے جنگلوں کی راہ لیں۔ دیکھا جائے تو دُنیا سے یہ کنارہ کشی ابلیس کی سب سے بڑی فتح ہے اس کا دعویٰ یہی تو تھا کہ انسان خلافتِ ارضی کا مستحق نہیں اگر آج ہم اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی بجائے فرار کی راہ اختیار کریں تو یہ اس کے باطل ادّعا پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے کے مترادف ہو گا۔ مذہبی طبقوں میں یہ مایوسی اور کاروبارِ دنیا سے عدم دلچسپی راست انداز سے نفوذ نہیں کرتی بلکہ عموماً توکّل کے حسین نام سے داخل ہوتی ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے کو ان حضرات نے توکّل سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ قرآنِ حکیم جس توکّل کی تعلیم دیتا ہے اس کے زمین و آسمان ہی دُوسرے ہیں جہاں تک ذرائع و وسائل اور اسباب کی فراہمی کا تعلق ہے اس میں مومن اور کافر دونوں میں کوئی امتیاز نہیں فرق صرف یہاں آکر واقع ہوتا ہے کہ کافر تو اسباب ہی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے لیکن مومن کی نظر اسباب کے باوجود کارسازِ حقیقی کی نصرت و اعانت پر لگی رہتی ہے۔

3۔ عُلمائے اسلام کے نزدیک کُفر کی پانچ اقسام ہیں:

• رسالت میں شک و شبہ کرنا۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے کفّار کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مَّرِيْبٍ

(بے شک وہ ریب و تشکّک میں مبتلا تھے۔)

• انبیاء ورسل کی تکذیب کرنا۔

وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ

(اور کافروں نے کہا کہ یہ ساحر اور جھوٹا ہے۔)

• پیغمبر کی دعوت سے روگردانی کرنا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّا اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ

(اور جس چیز سے کافروں کو ڈرایا جاتا ہے اس سے اعراض کرتے ہیں)

• کفرِ نفاق

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۘ

(اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور قیامت پر ایمان لائے۔ حالانکہ وہ مومن نہیں۔)

• اور پانچویں قسم کفر کی وہ ہے جس کا اولین ارتکاب ابلیس نے کیا۔

کفرِ استکبار۔

اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ

(اس نے انکار کیا اور تکبّر کیا اور وہ کافروں میں سے ہوگیا۔)

غفلت اور ذہول کے باعث شریعتِ الٰہی کے کسی حکم کا تارک ہونا معصیت ہے۔ اس سے آدمی کافر نہیں ہوتا لیکن شریعت کے کسی حکم کا انکار اور اس کے مقابلے میں تکبّر کی روش ایمان ہی کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ غالباً یہی وہ استکبار ہے جس کے متعلق حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبّر ہوگا وہ جنّت میں داخل نہیں ہوگا۔ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ۔

حضرت حوّا

قرآنِ حکیم میں حضرت آدم کی بیوی حضرتِ حوّا کا ذکر تین سورتوں میں آتا ہے۔ سورۃ البقرہ، سورۃ الاعراف اور سورۃ طٰہٰ۔ سورۃ البقرہ میں کہا گیا ہے

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

(اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمھاری بیوی بہشت میں رہو اور اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو گے۔)

سورہ الاعراف میں سورۃ البقرہ ہی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ارشاد ہوتا ہے۔

يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

البتہ سورۃ طٰہٰ میں انداز ذرا مختلف ہے ارشاد ہوا

يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ

(اے آدم! یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔)

نسلِ انسانی کی یہ پہلی خاتون کس طرح پیدا ہوئی؟ قرآنِ حکیم میں کہیں اس کا ذکر موجود نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جن آیات پر اس مضمون کا شبہ ہو سکتا ہے وہ سورۃ الزمر، سورۃ ن اور سورۃ اعراف کی وہ آیات ہیں جن

ہیں عورتوں اور مردوں کے "نفسِ واحدہ" سے پیدا کئے جانے کی تصریح ہے لیکن ان کے سیاق وسباق پر غور کرنے کے بعد آدمی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان میں خطاب عام انسانوں سے ہے۔ یہاں خصوصیت سے صرف آدم اور حوّا مُراد نہیں لیے جا سکتے مثال کے طور پر سُورۃ نساء کی اس آیت کا مُطالعہ کیجیے۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا۔

(اے لوگو! اس رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑ پیدا کیا۔)

تقریباً تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں خطاب نوعِ انسانی سے ہے اور اس آیت میں نفسِ واحدہ سے مُراد حضرت آدم ہیں۔ اور ھا کی ضمیر حضرت حوّا کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ نوعِ انسانی میں ذات پات کی بنیاد پر کسی شخص کو کسی دُوسرے شخص پر فضیلت حاصل نہیں اس اعتبار سے تمام انسان برابر ہیں۔

قرآن کے بعد توریت سے استمداد کیجیے تو وہ البتہ تخلیقِ حوّا کی متعین صورت بیان کرتی ہے۔

"خُداوند خُدا نے آدم پر پیاری نیند بھیجی کہ وہ سوگیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خُدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک صُورت بنا کر آدم کے پاس بھیجا"

غالباً استعارہ اور تمثیل کے اس توراتی بیان ہی کا اثر ہے کہ بعض کتبِ تفسیر میں عام طور پر یہ روایت پائی جاتی ہے کہ حضرت حوّا آدم کی پسلی سے پیدا

ہوئیں۔ مثال کے طور پر سدی ابی صالح سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت حوّا حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہو چکیں تو فرشتوں نے آدم سے سوال کیا۔

ما اسمُھا یا آدم

(اس کا نام کیا ہے؟)

انھوں نے جواب دیا حوّا۔ فرشتوں نے پُوچھا وہ کیسے؟ فرمایا:

لانھا خلقت من شیءٍ حیٍّ

(اس لیے کہ اس کی تخلیق ایک زندہ سے ہُوئی۔)[1]

مسلم اور بُخاری کی یہ حدیث بھی تائید میں پیش کی جاتی ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہ ہیں۔

انّ المراءۃ خلقت من ضلع لن یستقیم لك علی طریقۃٍ فَاِن استمعت بھا استمعت و بھا عوجٌ وَ اِن وھبت تقیمھا کسرتھا وکسرھا طلاقھَا

(عورت پسلی سے بنائی گئی ہے وہ کبھی ایک سیدھے طریقہ پر تمھارے ساتھ بسر نہیں کر سکتی اب اگر اس سے نفع حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کجی کے ساتھ نفع حاصل کرتے رہو اگر کہیں تم نے اس کو سیدھا کرنے کا ارادہ کیا تو یاد رکھو تم اس کو توڑ دو گے۔ یعنی اس کو طلاق دینی ہو گی۔)

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ اس حدیث میں کہیں حوّا کا نام نہیں لیا گیا۔ بات عام عورتوں کے متعلق کی گئی ہے۔ چنانچہ اس مضمون میں ایک دُوسری حدیث سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے جس میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص 74

اَلنِّسَاءُ خُلِقْنَ مِنْ ضِلْعٍ

(عورتیں پسلی سے پیدا ہوتی ہیں)

اور اگر لغت کے اعتبار سے اس ٹکڑے کا ایک اور ترجمہ کرنے کی اجازت دی جائے تو ہم عرض کریں گے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں کجی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہم نہیں بڑے بڑے ائمہ فن کہتے ہیں کہ ضلع کے معنی کجی کے بھی لغتِ عرب میں مستعمل ہیں ابنِ اثیر کہتے ہیں۔

الضلعُ الاعوجاج اتی الزیغ [1]

اور عورت کجی سے پیدا ہوئی کا جملہ اس طرح کا ہے جس طرح قرآن حکیم میں آتا ہے کہ۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ

(انسان جلدی سے پیدا کیا گیا ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ جلد بازی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔

یا پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے تشبیہ کے طور پر عورت کو پسلی سے تعبیر فرمایا ہے کہ اس کو اگر سختی سے سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے اور اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اس کی کجی کبھی زائل ہی نہ ہو اسی لیے وصیّت فرمائی کہ اس کے ساتھ حکمت سے پیش آؤ، اور خوب صورتی سے معاملہ کرو۔ چنانچہ بخاری کی ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہیں۔

المراءۃ کالضلع — عورت پسلی کی مانند ہے۔

---

[1] کنزالاعمال ج 8 کتاب النکاح ص 260

[2] النہایۃ والبدایۃ ص 14

اور یہی وہ مفہوم ہے جو بعض مشہور اہلِ علم کے نزدیک قرینِ صواب ہے
مجمع البحار میں ضِلع کے تحت مرقوم ہے۔

خلقن من ضلعٍ استعارۃٌ للعوج ای خلقن خلقاً فیھا الاعوجاجُ[1]
(خلقن من ضِلع ایک استعارہ ہے مطلب یہ ہے کہ وہ ایک ایسی خلق پر پیدا کی گئی ہیں جس میں کجی پائی جاتی ہے۔)

زوج کے لفظ میں حکمت

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو جنت میں سکونت پذیر ہونے کا انعام عطا فرماتے وقت جس طرح خطاب فرمایا وہ یہ تھا کہ یٰاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ یوں نہیں فرمایا کہ۔

یٰاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَامْرَاَتُکَ الْجَنَّۃَ

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب بادی النظر میں زوج اور امرآۃ دونوں ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں تو پھر یہاں امرآۃ کی بجائے زوج کا لفظ منتخب فرمانے میں کیا خاص راز ہے؟ مُفسّرین کرام خصوصاً امام ہمام امام ابنِ قیم رح نے زوج اور امرآۃ کے اس لطیف فرق کو خوب خوب واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں زوج کا لفظ جہاں کہیں استعمال ہوا ہے مومن مرد اور مومنہ عورت کے درمیان استعمال ہوا ہے۔ کسی کافر مرد اور کافر بیوی کے لیے اس لفظ کے استعمال کی نظیر نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر ابولہب اور اس کی بیوی کا تذکرہ فرمایا تو ارشاد ہوا۔

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ ـــــ الی قولہ ـــــ وامرأتہٗ حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ

---

[1] مجمع البحار

مومنین کا ذکر آیا تو فرمایا۔ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ

حدیہ ہے کہ بعض جلیل القدر انبیاء کی بیویاں جو عقیدۃً شرک پر قائم رہیں، ان کا حوالہ دیتے وقت بھی قرآن حکیم انھیں امرآۃ کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَةَ نُوحٍ وَامْرَأَةَ لُوطٍ"

اس کے برعکس حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے لیے قرآن حکیم "ازواج" کا لفظ پسند کرتا ہے۔

إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ

مومنین کے لیے بھی اسے یہی لفظ پسند ہے۔

وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ

قرآن کی تمام متعلقہ آیات میں استثنائی مقام صرف دو ہیں ایک حضرت زکریا علیہ السّلام کے متعلق حقِ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا" اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق حقِ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ" فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ ـــــ سہیلی کہتے ہیں۔ چونکہ سیاق میں ذکر حمل اور ولادۃ کا ہے اس لیے یہاں لغوی اعتبار سے امراۃ کا لفظ زیادہ مُناسب اور برمحل تھا۔ وگرنہ اس کا سبب وہ نہیں جو ہم اُوپر کی سطور میں بیان کر چکے ہیں۔

سہیلی اور بعض دُوسرے ارباب علم نے امراۃ اور زوج کا یہ فرق بیان کرتے ہُوئے صراحت کی ہے کہ چُونکہ دُنیا میں مشرک مرد اور مومنہ عورت کا نکاح نکاحِ باطل ہے اور وہ آخرت میں ایک دُوسرے کے زوج نہیں بنیں گے، اس لیے ان کے متعلق قرآن زوج کا لفظ لانے سے احتراز کرتا ہے۔ مثال کے طور پر فرعون کی مومنہ بیوی حضرت آسیہؓ اور فرعُون کی بات آتی ہے تو ارشاد ہوتا ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ

امرأۃ اور زوج کے الفاظ کا یہ لطیف فرق علمائے سلف نے بہت خوب بیان کیا ہے۔ لیکن اس میں مزید باریکیاں اور نزاکتیں کیا ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہم ایسے عاجز و ناکارہ لوگ ان کا احاطہ ہی نہیں کر سکتے۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ٹھیک کہا کہ "واسرار مفردات القرآن و مرکباتہ فوق عقول العالمین"

مرد برتر ہے

قرآنِ حکیم کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ وہ بڑے بڑے اہم مسائل کو چند مختصر لفظوں کے ضمن میں حل کر جاتا ہے مثال کے طور پر اس زیر بحث آیت کو لے لیجیے۔

يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

اس انداز خطاب میں یہ واضح کرنا بھی مقصود ہے کہ مرد عورت سے افضل ہے اور خالقِ کائنات نے قوتوں اور صلاحیتوں، مصالح اور حکم کے اعتبار سے عورت کو مرد کا تابع پیدا کیا ہے۔ یہاں جنت میں داخلے کا حکم آدم اور حوّا دونوں کے لیے ہے۔ لیکن دیکھ لیجیے اللہ تبارک تعالیٰ یہ حکم دیتے ہوئے خطاب صرف حضرت آدم کو فرماتے ہیں اور اسی ذیل میں حضرت حوّا کا بھی ذکر کرتے ہیں اور دیکھا جائے تو انداز مناسب و موزوں بھی یہی ہے۔ حضرت آدم پیغمبر ہونے کے علاوہ خاوند ہونے کی حیثیت میں بھی حضرت حوّا کے لیے متبوع تھے۔ انھیں اپنے احکامِ عالیہ سے باخبر کر دینے کے بعد حوّا کو الگ مخاطب کرنے کی ضرورت ہی کہاں باقی تھی۔؟

جنّت

"زوج" کے بعد آیتِ مذکورہ میں دُوسرا قابلِ غور لفظ جنّت ہے۔ یہ بحث ہم انشاء اللہ آگے چل کر کریں گے کہ اِس سے مُراد جنّتِ ارضی ہے یا جنّت الماویٰ یہاں ہم صرف لغوی حیثیت سے اس کا مفہوم بیان کرنا چاہتے ہیں اور بعض ان غلط فہمیوں کو دُور کرنا چاہتے ہیں جو جنّت کے متعلق عام طور پر لوگوں کے دل و دماغ میں پائی جاتی ہیں۔

لُغت میں جنّت اس باغ کو کہتے ہیں جس کا سایہ بہت گھنا ہو اور جس کے درختوں کی شاخیں باہم دگر دُور تک ایک دوسرے کے اندر گھُستی چلی گئی ہوں۔ ایک ایسا باغ جس کے درخت اتنے زیادہ ہوں کہ زمین کو پوری طرح ڈھانپ لیں۔ امام راغبؒ کہتے ہیں۔

کل بستان ذی شجر یستر باشجارہ الارض

چنانچہ قرآن حکیم نے دُنیا کے باغوں کو بھی مُتعدد مقامات پر جنّت سے موسُوم کیا ہے۔

وَجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ

(اور انگور اور زیتون اور انار کے باغ متشابہ اور غیر متشابہ)

وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ (سورۃ شعراء)

(اور (زمین) میں ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ لگائے اور ان میں

چشمے جاری کیے پس ہم نے نکال دیا ان کو باغوں، چشموں اور عزّت کی جگہ سے۔)

وَلَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ

(اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تُو نے کیوں نہ کہا جو خُدا چاہے اور طاقت نہیں مگر خُدا کے لیے۔)

اللہ تبارک تعالیٰ نے مؤمنین کے لیے آخرت میں جس جنّت کا اہتمام فرما رکھا ہے اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس مادّی زندگی میں ہم اس کا تصوّر نہیں کر سکتے۔ البتہ ہمیں ایک ہلکا سا اندازہ کرانے کے لیے قرآن نے جگہ جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے کہ اس میں دریا جاری ہوں گے۔ پاکیزہ بیویاں اور خوبصورت محلّات ہوں گے۔ انواع و اقسام کے پھل اور طرح طرح کی نعمتیں ہوں گی۔ اس دُنیا میں بھی یہ چیزیں موجُود ہیں۔ مگر احادیث و روایات سے معلُوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ان چیزوں کو جنّت کی اشیاء سے کوئی نسبت ہی نہیں دی جا سکتی۔ حضرت عبد اللہ ابنِ عباس کی یہ روایت عام طور پر کتبِ تفسیر میں نقل ہوئی ہے کہ:۔

لیس فی الدنیا من الجنة شیءٌ الا الاسماء (ابنِ جریر)

(دُنیا میں نام کے سوا جنّت کی اور کوئی چیز نہیں ہے۔)

لیکن حیرت ہوتی ہے جب اسی روایت کے پہلُو بہ پہلُو ہم جنّت اور اس کے درختوں اور پھلوں کے متعلق طرح طرح کے قیاسات اور خیالات بھی جلوہ گر پاتے ہیں۔ اور اللہ کے رسُول پر ایمان لانے کے بعد ایک مومن ہر اس بات کو جو بظاہر کتنی ہی غیر عقلی نظر کیوں نہ آتی ہو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے جب قرآن اور حدیث سے ثابت ہے۔ لیکن اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ محض ظن اور تخمین سے وہ اسلام کو عجائبات کا مذہب بنا ڈالے۔ جنّت میں جسمانی اور رُوحانی تمام

لذّتیں اور راحتیں مُہیّا ہوں گی۔ اہلِ جنّت دیدارِ خداوندی کی نعمتِ عظمیٰ سے بھی سرفراز ہوں گے۔ آیت کریمہ کے مطابق کہ

لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ

(اس جنّت میں تمھارے لیے وہ سب کچھ ہے جسے تم چاہو گے اور اس میں وہ بھی ہے جو تم مانگو گے۔)

آخر اس ایک اجمالی عقیدہ کے بعد اس طرح کی خیال آرائیوں کی حاجت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے کہ جنّت میں ایک ایک پھل مٹکے کے برابر ہو گا۔ ابنِ جریر پر اللہ کی رحمت ہو انھوں نے اپنی گراں قدر تفسیر میں جہاں جہاں اس طرح کی روایتیں جمع کر دی ہیں جو کسی آیتِ قرآنی یا کسی حدیثِ نبوی پر مبنی نہیں محض بعض قدماء کی ذہنی اُپج ہیں، وہاں عقلِ سلیم کو خواہ مخواہ حرف گیری کرنے کا موقع مِل جاتا ہے مثال کے طور پر یہ روایات کہ۔

نخل الجنة نضيدٌ من اصلها الى فرعها وثمرها امثال القلال كلما نزعت ثمرة عادت مكانها اُخرىٰ وساقها تجرى فى غير اُخدود[1]

(جنّت کے درخت جڑ سے لے کر شاخ تک یکساں ہوں گے اور اس کے پھل مٹکوں کے برابر ہوں گے۔ جب بھی کسی درخت سے کوئی میوہ توڑا جائے گا۔ اس کی جگہ معاً دُوسرا پھل آجائے گا اور جنّت میں پانی نالیوں کے بغیر بہہ رہا ہو گا۔)

جنّت کے متعلق یہ جتنی بھی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ہمارے لیے سب قابلِ قبُول ہیں۔ بشرطیکہ یہ بتا دیا جائے کہ ان کی سند کیا ہے؟ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے کب اور کس موقع پر یہ باتیں ارشاد فرمائی ہیں؟ صحاح کے کس مجمُوعے

---

[1] تفسیر الطبری ج ۱ ص 384

میں یہ شامل ہیں؟ اور اگر ایسا نہیں اور یہ خیالات صرف راویانِ کرام کے ہیں تو ہمیں معاف فرمایا جائے۔ اگر ہم یہ عرض کریں کہ جنّت کا حسن و جمال بیان کرنے کے لیے اس طرح کے سہارے تلاش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ خُدائی حُسن ہے اور ہم جیسے انسانوں کی مشاطگی سے یکسر ماورا، و بے نیاز۔ جس مقام کے رہنے والوں کی عظمت کا عالم یہ ہے کہ وہ "کُن" کہہ کر عدم کو وجُود کا مرتبہ دے سکیں، اس مقام کی رفعتیں ہم خاکیوں کی فہم میں کہاں آسکتی ہیں؟ حدیث میں آیا ہے کہ:-

("جنّت والوں کے پاس خُدا کا فرشتہ آئے گا۔ پہلے حاضر ہونے کی اجازت حاصل کرے گا اور ان کے پاس پہنچ کر ایک مکتُوب حوالے کرے گا۔ یہ مکتوب خالقِ کائنات کی طرف سے اہلِ جنّت کے نام ہوگا جس میں سلام کے بعد لکھا ہوگا کہ خُدائے حیّ و قیّوم کی طرف سے جو کبھی نہ مرے گا۔ یہ خط ان لوگوں کے نام ہے جو حیّ و قیوم ہو چکے ہیں اور کبھی نہ مریں گے۔ اما بعد (پس معلوم ہو کہ) میں جس چیز کو کہتا ہُوں کہ وہ ہو جائے وہ ہو جاتی ہے۔ اور اب تم کو بھی یہی بنا دیتا ہُوں کہ جس شے کو کُن کہو گے وہ ہو جائے گی۔ شیخ ابنِ عربیؒ کہتے ہیں کہ اس خط کی عبارت نقل کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (اس خط کو پانے کے بعد) جنّت والوں میں سے جو بھی کسی چیز کو کُن کہے گا تو اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ فوراً وہ چیز ہو جائے[1]")

---

[1] فتوحاتِ از ابنِ عربی، ترجمہ مولانا مناظر احسن گیلانی

تعیینِ شجرہ

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ذکر اس کا ہو رہا تھا کہ حضرت آدم اور ان کی بیوی سے فرمایا گیا کہ وہ جنّت میں رہیں سہیں مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی گئی کہ وہ اس درخت کے پاس نہ جائیں وگرنہ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔ آدم اصلاً تو زمین میں نائبِ حق بنا کر بھیجے جا رہے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے ان کا یہ قیام عارضی تھا۔ مقصود اس سے یہ ہو گا کہ دُنیا میں اُتارے جانے سے پہلے انسانِ اوّل جنّت کو اچھی طرح دیکھ بھال لے۔ پھر وہ اور اس کی ذرّیت زمین کو اسی نقشۂ جنّت کے مُطابق بنانے سنوارنے کی کوشش کرے۔ مزید برآں جنت کے اس عارضی قیام کے دوران ایک پہلو آزمائش و امتحان کا تھا۔ آدم کو ان کے مضبُوط دشمن ابلیس کی قوّتِ کارکردگی کا اندازہ کرانے کے لیے ایک درخت کا تعیّن کر کے یہ فرمایا گیا کہ اس کا پھل کھانا تو ایک طرف رہا اس کے قریب بھی مت پھٹکنا ورنہ خسارے میں رہو گے۔ یہ درخت کون سا تھا؟ کس چیز کا تھا؟ قرآنِ مجید میں اس کی کوئی تصریح نہیں پائی جاتی۔

البتّہ توریت کا بیان ہے کہ یہ نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا:

"اور خُداوند خُدا نے آدم کو لے کر باغِ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور نگہبانی کرے اور خُداوند خدا نے آدم کو حکم دے کر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھایا کر لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا۔ کیوں کہ جس دن تو اُسے کھائے گا، ضرور مرے گا۔"

(پیدائش باب ۲ آیات 16، 17)

مُفسّرینِ کرام نے اس باب میں جو قول نقل کیے ہیں ان میں کھجور، کافور، انگور

انجیر، زیتون سے لے کر گندم تک کے مختلف نام سامنے آتے ہیں۔ بعضوں نے کہا کہ شجرۂ محبت تھا۔ کسی نے کہا شجرۂ ہوٰی اور کسی نے کہا شجرۂ علم۔ نئے دور کے اصحابِ قلم بھی اس سلسلے میں پیچھے نہیں رہے بلکہ پیچھے نہ رہنے کا کیا سوال مزید چند قدم آگے بڑھے۔ ان کے ہاں شجرہ مُشاجرت سے نکلا ہے۔ کہنا ان حضرات کا یہ ہے کہ آدم علیہ السّلام کو تفرقہ پردازی اور گروہ بندی سے روکا گیا تھا۔

تعیینِ شجرہ کے متعلق قدیم وجدید سب آراء کا مُطالعہ کر لیجیے۔ بجُز ذہنی انتشار کے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بعض ستم ظریفوں نے اس درخت کو دانۂ گندم ٹھہرانے کے بعد دانۂ گندم سے تشبیہات اور استعاروں کی ایک اور فصل اُگانے کی کوشش کی ہے۔ غرضیکہ جو نکتہ جسے بھی سُوجھ گیا اس نے بلا تامّل اُسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ حالانکہ اس ساری بحث میں سوچنے کی بات ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ جب خدا اور رسُول کسی نے بھی اس درخت کا تعیّن نہیں فرمایا تو ہمیں یہ حق کیسے مل گیا کہ محض خیال آرائیوں سے اس درخت کی اصلیت پانے کی کوشش کریں۔ اگر اس نام کے جھگڑے میں نوعِ انسانی کا کچھ بھی بھلا ہوتا تو قرآن وحدیث میں یقیناً اس کی صراحت کر دی جاتی۔ لہٰذا راہِ صواب یہی ہے کہ جب قرآن وحدیث اس مسئلہ میں خاموش ہیں تو ہمیں بھی سکوت اختیار کرنا چاہیے۔ شروع سے لے کر تمام محققینِ اُمّت اسی مسلک کے پابند چلے آئے ہیں۔ ابنِ جریرؒ کہتے ہیں۔

وَلا عِلم عندنا بأیّ شجرۃ کانت علی التعیین لان اللہ لم یضع لعبادہٖ دلیلاً علٰی ذٰلکَ فِی القراٰن ولا فی السنۃ الصحیحۃ

(اور ہم نہیں جانتے کہ متعین طور پر یہ درخت کون سا تھا۔ کیونکہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس بارے میں اپنے بندوں کے لیے کوئی بات ارشاد نہیں فرمائی اور نہ ہی سنّت صحیحہ میں اس طرح کی کوئی واضح بات موجود ہے۔)

صاحبِ تفسیرِ کبیر امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

ولا علم عندنا بایۃ شجرۃ کانت علی التعیین فلا حاجۃ ایضا الیٰ بیانہٖ

(ہم متعین طور پر یہ علم نہیں رکھتے کہ یہ درخت کون سا تھا۔ اس لیے اس کے بیان کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔)

فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

اب دیکھنا یہ ہے کہ درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے کا مفہوم کیا ہے؟ آدم اور حوّا کو درخت کی قربت سے منع فرمایا گیا تو کیا یہ نہی منجملہ احکامِ شریعت تھی یا اس کی حیثیت محض نہیِ ارشادی کی تھی؟ ظالمین کے لفظ سے کیا مراد ہے۔ اور قرآن حکیم میں یہ لفظ کن معنوں میں استعمال ہوا ہے؟

عام طور پر یہی سمجھا گیا ہے کہ اس درخت کے پاس جانا گناہ تھا اور آدم و حوّا اس کے قریب جا کر گناہ کے مُرتکب ہوئے۔ دلیل اس سلسلے میں ایک ہی پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے مُتنبہ فرما دیا تھا کہ اگر ایسا کرو گے تو ظالمین میں سے ہو جاؤ گے اور ظالمین چونکہ گناہ گاروں کے لیے بولا جاتا ہے اس لیے درخت کے قریب جانا واضح طور پر گناہ کی تعریف میں آئے گا۔

ہمارے نزدیک یہ دعویٰ متعدد وجوہ سے محلِ نظر ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ظالمین کا مفہوم ضروری نہیں کہ ہر حال میں

گناہ گار ہی لیا جائے گا۔ بلاشبہ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔ لیکن ظالمین کے لفظ کی وسعتیں صرف اسی معنی و مطلب میں محدود و محصور نہیں۔ کلامِ الٰہی میں اسے اپنے اُوپر (نادانستہ) زیادتی کرنے والوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ (احزاب)

(ہم نے پیش کی امانت آسمانوں کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو پھر کسی نے قبول نہ کیا کہ اس کو اُٹھائیں اور (وہ) اس سے ڈر گئے اور اُٹھا لیا اس کو انسان نے۔ یہ ہے بڑا ظالم نادان۔)

آیتِ بالا میں ظلوماً کے محلِ استعمال پر غور فرمایئے۔ اگر یہاں آپ اس کا ترجمہ گناہ گار سے کرتے ہیں تو اس کا جواب دینا آپ کے ذمے ہے کہ روزِ ازل میں جس کا واقعہ قرآن بیان فرما رہا ہے، انسان غریب سے کون سا گناہ سرزد ہوا تھا کہ اسے گناہ گار کے نام سے یاد فرمایا گیا؟ اور اگر ظالم سے آپ یہ مُراد لیں کہ کسی دُوسرے پر ظُلم کرنے والا تو یہ سوال تب بھی جُوں کا تُوں ہے۔ آخر اس وقت کسی اور پر ظُلم کرنے کا موقع ہی کہاں پیدا ہوا تھا؟

صاف معلوم ہوا کہ ان دونوں ترجموں میں سے کوئی ترجمہ موزُوں نہیں ــــ تشریح یہاں یُوں کرنی پڑے گی کہ "بے شک انسان اپنے اُوپر زیادتی کرنے والا نادان ہے"۔

ہماری اس بات کو ایک اور آیۂ قرآنی کے ضمن میں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ سُورہ بقرہ میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو مقامِ امامت پر سرفراز کرنے کا ذکر آیا ہے وہیں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا یہ سوال بھی موجُود ہے کہ کیا میری

اولاد بھی اس عنایت کی مستحق قرار دی جائے گی؟ اس پر اللہ جلّ شانہٗ کا جواب ان لفظوں میں سامنے آتا ہے کہ

لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔

(میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا۔)

بلاشبہ اس مقام پر ظلم کا لفظ کفر، فسق اور معصیت کے لیے وارد ہے اور ائمۂ تفسیر نے بھی اس کی یہی تشریح کی ہے۔

قد فسر الظلم ھھنا بالکفر وھو قول ابن جبیر وبظلم العاصی غیر الکفر وھو قول عطاء السدی[1]

گویا حق تعالیٰ نے فیصلہ یہ فرمایا کہ منصبِ امامت (اور اس کی اعلیٰ ترین شکل کا نام ہی نبوّت ہے) گناہ گاروں کو عطا نہیں کیا جائے گا۔ اب اس فیصلے کی روشنی میں فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ کی شرح و تفسیر پر غور کیجیے۔ اگر آپ یہاں بھی ظالمین کا ترجمہ گناہ گار کرنے پر بضد ہیں تو سوچ لیجیے کہ اس کا منطقی نتیجہ کیا برآمد ہوگا؟ آپ قرآنی فیصلہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر چکے کہ گناہ گار نبی نہیں ہو سکتا اور اِدھر آپ مُصر ہیں کہ حضرت آدمؑ نے درخت کا پھل کھا لیا۔ اس لیے وہ گناہ گار ہو گئے۔ بالفاظِ دیگر گویا وہ پیغمبر نہیں تھے۔ اور یہ نتیجہ چونکہ قرآن و حدیث کی متعدّد تصریحات سے متعارض ہے اس لیے معلوم ہُوا کہ اس مقام پر ظٰلمین کا وہ ترجمہ ہی درست نہیں جس کی رُو سے حضرت آدم ارتکابِ معصیت کے خطاوار نظر آتے ہیں۔ صحیح ترجمہ یہی ہوگا کہ "تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ اپنے اُوپر زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔"

ابھی ہماری تشریح میں ایک اور اُلجھن باقی ہے۔ آپ پُوچھ سکتے ہیں کہ جب

---

[1] تفسیر ابنِ حیان

اس درخت کے قریب جانا گناہ نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد اس لیے فرمایا تھا کہ آدم اور حوّا ذاتی نقصان اور خسارے سے بچ سکیں تو پھر صیغۂ امر کیوں استعمال فرمایا کہ ۔ وَلَا تَقْرَبَا تم دونوں مت قریب جاؤ۔

صیغۂ امر و نہی سے یہ شبہ لاحق ضرور ہوتا ہے مگر قرآن میں اس کی بھی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ صیغہ امر میں بات ہو رہی ہے لیکن مقصود اس سے صرف عطائے اجازت ہے۔ مثلاً یہ بیان کرتے ہوئے کہ رمضان کی راتوں میں تمھارے لیے عورتوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا، فرمایا جاتا ہے۔

فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ پس اب تم ان سے مباشرت کرو۔

یہاں باشر امر کا صیغہ ہے لیکن اگر آپ اسے لازماً حکم سمجھ بیٹھیں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ قرآن کے نزدیک رمضان کی راتوں میں اپنی بیوی کے پاس نہ جانے والا مجرم ہے حالانکہ یہ نتیجہ قبول کرنے پر رضامند آپ بھی نہیں۔

ہمارے خیال میں اوپر کی ایک مثال سے بات بڑی حد تک واضح ہو چکی ثابت ہو گیا کہ قرآن میں امر کا صیغہ صرف اسی لیے نہیں آتا کہ اس کے برعکس عمل کرنے والا خاطی و مجرم ٹھہرے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اجازت دی جا رہی ہو اور صیغۂ امر کا استعمال کیا جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مخاطب کے اپنے فائدے کے لیے اسے نصیحت کی جا رہی ہو اور انداز امر و نہی کا اختیار کیا جائے ـــــ اس تصریح کے بعد آیت کے اس ٹکڑے کی صحیح تشریح یہ یہ قرار پائی کہ اللہ تبارک تعالیٰ کی یہ نہی کہ درخت کے قریب نہ جانا صرف ارشاد تھی کوئی شرعی ممانعت نہیں تھی بتایا یہ جا رہا تھا کہ اگر تم اس کے قریب گئے تو ہر چند کہ اس سے حکمِ شریعت کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہو گی مگر تم اپنے اوپر زیادتی کرنے والے بن جاؤ گے اور تمھیں ذاتی طور پر خسارے اور گھاٹے ہیں

مُبتلا ہونا پڑے گا۔

شیطان کی وسوسہ اندازی

اُدھر آدم وحوّا کو جنّت میں سکونت پذیر ہونے کا پروانہ مل رہا تھا اور ادھر ابلیس غصّہ اور حسد کی آگ میں جل بھُن کر انھیں زک پہنچانے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ جنت کے فلاں درخت کے قریب جانے سے ان دونوں کو ممانعت کی گئی ہے تو اسے انتقام لینے کی ایک ترکیب سُوجھی انتہائی ہمدرد اور خیر خواہ بن کر ان کے پاس آیا اور کہا کہ جو کچھ ہو چکا اس پر خاک ڈال دو ماضی کی تلخ یادوں کو بھُول جاؤ اور میرے پچھلے طرزِ عمل کو مُعاف کر دو۔ مستقبل کے لیے میں تمھاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہُوں اور اگر چاہو تو اس کا عملی ثبوت دینے کے لیے تمھیں ایک ایسے درخت کی بھی نشان دہی کروں جس کے کھانے سے تم لازوال ہو جاؤ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یادِ خُدا میں مشغول رہ سکو قرآن بتاتا ہے کہ شیطان نے کہا۔

هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَملك لايُبْلٰى

(کیا تمھیں ہمیشگی کے درخت اور ایک لازوال بادشاہت کی خبر دُوں)

آدم وحوّا نیک فطرت وسادہ طینت تھے حضرتِ حق نے ان کے سینے کینے اور بغض وحسد سے پاک بنائے تھے۔ ادھر ابلیس گھاٹ گھاٹ کا پانی ہُوئے تھا۔ بات بنانے کے فن کا ماہر "جھُوٹ کو اتنا دہراؤ اتنا دہراؤ کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے" کے اصُول کا مُوجد۔ اس کی چکنی چپڑی باتوں نے آدم وحوّا دونوں کو متاثر کر لیا، سوچا ہو گا کہ اگر لازوال زندگی کی نعمت مل سکے تو اور کیا چاہیے۔ ایک ایک لمحہ رضائے حق کے حصُول میں صرف کرنے

کا موقع مل جائے گا اور خدائے عزّوجلّ کا قُرب مہیّا رہے گا۔ پُوچھنے لگے وہ درخت ہے کون سا؟ ابلیس نے اس شجرِ ممنُوعہ کی طرف رہنمائی کی۔ اس پر دونوں نے کہا "اس درخت سے تو ہم روکے جا چکے ہیں کہ اس میں ہمارے لیے ضرر ہی ضرر اور نقصان ہی نقصان ہے پھر اس کے قریب کیسے جائیں"۔ شیطان نے پینترا بدلا، کہا کہ بلاشبہ تمھیں اس درخت سے روکا گیا تھا۔ لیکن وہ تو ایک عارضی ممانعت تھی۔ وگرنہ یہ درخت تو ایسا ہے کہ اس کا پھل کھالو تو حیاتِ جاوید مل جائے اور فرشتے بن کر دربارِ الٰہی میں ہمیشہ تمجید و تحمید پر مامُور ہو جاؤ تم عنقریب دُنیا میں بھیج دیئے جاؤ گے۔ جہاں تمھیں رضائے الٰہی کے اس مقام و محل سے دُوری گوارا کرنی ہو گی۔ یہ پھل کھالو تو ابد تک اسی مقامِ قُرب پر متمکن ہو جاؤ۔ قرآن کے الفاظ میں شیطان نے جواب دیا۔

مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخَالِدِيْنَ

(تمھارے رب نے تمھیں اس درخت سے منع نہیں کیا۔ مگر اس لیے کہ کہیں تم اس کے کھانے سے ہمیشہ زندہ رہنے والے یا فرشتے نہ بن جاؤ۔)

اس فریب میں بڑی کشش تھی اور اس حسین دھوکے میں بڑی اپیل تھی۔ لیکن فقط اتنی سی یقین دہانی پر آدم و حوّا اس کے جھانسے میں کیسے آجاتے انھوں نے اس بات کو قبول کرنے سے انکار کیا ہو گا اور ابلیس نے اصرار یہاں تک کہ شیطان نے ایک اور چال چلی۔ قسمیں کھانے لگا کہ جو کچھ کہہ رہا ہُوں سچ کہہ رہا ہُوں اور یہ کہ میں تمھارا ہمدرد و غم گُسار ہُوں۔

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ

خدا کی قسم درمیان میں آئی تو معاملہ مختلف ہوگیا۔ یہ بات آدم وحوّا کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی کہ یوں خُدا کے نام کی جھوٹی قسمیں کھائی جا سکتی ہیں اس عظیم و برتر ذات کو گواہ ٹھہرا کر بھی کوئی فریب دے سکتا ہے۔ آخر کار اس کے فریب میں آ گئے، درخت کا پھل کھالیا۔ اللہ تبارک تعالیٰ پہلے ہی بتا چکے تھے کہ اس درخت کی قربت تمھارے لیے عظیم خسارے کا مُوجب ہوگی۔ چنانچہ وہی ہوا انھیں جنّت سے نکلنا پڑا۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ وہ زمین پر اُتر کر فرائضِ خلافت سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں۔ قرآنِ عزیز فرماتا ہے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ

(پھر شیطان نے ڈگمگا دیا اس درخت کے سبب اور جس میں تھے اس سے انھیں نکلوا دیا۔)

شیطان کے اس فریب اور جنّت سے حضرت آدم وحوّا کے اخراج کے مُتعلق مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

ا۔ اگر یہ جنّت آسمانی جنّت تھی تو اس میں شیطان کیسے داخل ہوگیا؟

ب۔ حضرت آدم پیغمبر تھے پھر ان سے یہ خطا کیوں کر ہوئی؟ کیا انبیائے کرام سے بھی گناہ سرزد ہو سکتے ہیں؟

توریت کا بیان

توریت نے شیطان کے دجل و فریب میں انسانِ اوّل کے مبتلا ہونے کی جو سرگذشت بیان کی ہے اس کا اقتباس حسبِ ذیل ہے۔

"اور سانپ کُل دشتی جانوروں سے جن کو خُداوندِ خُدا نے بنایا تھا چالاک تھا اور اسی نے عورت سے کہا کیا واقعی خُدا نے کہا ہے کہ باغ

کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا اور نہ چھُونا۔ ورنہ مرجاؤ گے، تب سانپ نے عورت سے کہا تم ہرگز نہ مروگے۔ بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اُسے کھاؤ گے تمھاری آنکھیں کھُل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔ عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لیے اچھّا اور آنکھوں کو خُوش نُما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لیے خوُب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اس نے کھایا۔

(پیدائش باب 3 آیات 1 تا 7)

معاندین اسلام اور بعض کم ظرف مستشرقین عموماً یہ الزام دیتے ہیں کہ قرآن حکیم توریت اور انجیل کا چربہ ہے اور قدیم واقعات بیان کرنے میں اس کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں۔ اس لغو الزام کی تردید میں قرآن سے بے شمار شہادتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہ بحث چونکہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لیے ہم اس پر کچھ زیادہ وقت صرف نہیں کرسکتے۔ صرف قارئین سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ توریت اور قرآن کے مندرجہ بالا ٹکڑوں کا مُطالعہ کرنے کے بعد خود ہی اندازہ کرلیں کہ پادری صاحبان کی بات میں کتنا وزن ہے۔ چربہ اُتارنا تو ایک طرف رہا قرآن مجید نے الٹا ان مخرب شُدہ کتابوں کے مندرجات کی اصلاح کی ہے۔ اس عظیم کتاب نے حق و باطل، سچ اور جھُوٹ، صحیح اور غلط کو الگ الگ چھانٹ کر انسانیت پر احسان کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کم نظر لوگ طعنہ یہی دیئے چلے جارہے ہیں کہ قرآن تو پہلی کتابوں کا خوشہ چین ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

اسی اُوپر ہی کے ٹکڑے کو لے لیجیے۔ موجودہ توریت نے عورت بے چاری کو تنہا مُوردِ الزام قرار دے دیا۔ خطا جو کچھ ہوئی اسی کی ذات سے۔ سانپ کے فریب میں مُبتلا ہُوئی تو صرف وہ۔ آدم کی لغزش کا باعث ہُوئی تو یہی نادان۔ اور سارے ان کارناموں کے باوجُود اہلِ توریت کا دعویٰ یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں عورت کا مقام بلند کیا تو ہم نے کیا۔

چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد

اور اسی پر بس نہیں آگے چل کر اس خطا کی ایک نام نہاد سزا بھی تجویز فرمائی وہی سزا جو اصل میں عورت کی عزّت و عظمت کی تنہا ضمانت ہے فرمایا گیا کہ:

"پھر اس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا تُو درد کے ساتھ بچّے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔" (آیات 16، 17)

مگر قرآن ان تمام تحریفات کا مُنکر ہے۔ وہ یہ کہہ کر عورت کی صفائی پیش کرتا ہے کہ

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ

(شیطان نے دونوں کو ڈگمگا دیا۔)

اس میں تنہا عورت ہی کا قصُور نہیں اگر یہ کوئی لغزش تھی تو اس کے مرتکب دونوں، ہُوئے مرد بھی اور عورت بھی شیطان نے بیک وقت دونوں کو فریب دیا۔ ایسا نہیں کہ اس کا پہلا شکار عورت تھی اور اس نے آگے مرد کو بھی مُتاثر کر لیا۔

اس طویل جُملۂ معترضہ کے بعد آیئے اب ہم آپ کے سوالات کی طرف متوجہ ہُوں۔

جنّتِ ارضی یا جنّت الماویٰ

آپ کا یہ سوال کہ اگر یہ جنّت آسمانی جنّت تھی تو ابلیس اس میں داخل کیسے

ہو گیا؟ اصل میں مکمل سوال نہیں۔ ایک بہت بڑے سوال کا ایک چھوٹا سا جز ہے اور وہ بڑا سوال یہ ہے کہ کیا یہ جنت، جنتِ ارضی تھی یا جنت الماویٰ؟ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ جنت ارضی تھی آسمانی نہیں تھی، ان کی متعدد دلیلوں میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے جس کا ذکر آپ نے کیا۔ لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ بجائے ایک جُز پر بحث کرنے کے ہم پُورے سوال ہی کا ناقدانہ جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس میں صحیح تر موقف کس کا ہے؟

حافظ ابنِ کثیر اور امام رازی کی روایت کے مطابق اس معاملے میں مشہُور مسلک چار ہیں:

انها جنت الخلد

(یہ جنت الخلد کا ذکر ہے۔)

الثانی جنة اعدها الله لهما

(یہ ایک اور جنت تھی جو بطورِ خاص اللہ تعالےٰ نے ان دونوں کے لیے تیار کی۔)

انها فی الارض

(یہ زمین میں تھی۔)

ورابعها الوقف

(اور چوتھا مسلک اس معاملے میں سکُوت اختیار کرنے کا ہے۔[1])

ان میں بھی مشہُور تر مسلک دو ہیں ایک جنت الخلد ہونے کا اور دُوسرے جنت ارضی ہونے کا۔ جمہُور اُمّت اسی کے قائل ہیں کہ یہ سارا واقعہ جنت الخلد کا ہے دُوسرے نقطۂ نظر کی حمایت میں سلف کی جن اکابر ہستیوں کا نام آتا ہے ان کا مرتبہ و

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص 75، 76

مقام بھی تعارف کا محتاج نہیں مختلف روایات میں یہ قول حضرت ابی ابن کعب حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت وہبؓ بن منبہؒ، حضرت سفیان بن عینیہ اور امام ابنِ تیمیہؒ سے مروی ہے اور حضرت امام ابو حنیفہ کی طرف بھی اسے منسوب کیا جاتا ہے۔

جن حضرات کے نزدیک یہ واقعات جنّتِ ارضی سے متعلق ہیں، ان کے اعتراضات حسب ذیل ہیں۔

- ابلیس جنّت میں کس طرح داخل ہوا؟
- جنّت میں تو ہمیشہ کی زندگی ہوگی پھر حضرت آدم اس سے کیونکر نکل سکے؟
- جنّت میں جھوٹ نہیں بولا جاسکتا، مگر یہاں ابلیس آدم وحوّا کو سبز باغ دکھاتا نظر آتا ہے؛
- جنّت دارالجزاء ہے مگر ممانعتِ شجرہ کے بعد تو دارالابتلاء نظر آتی ہے۔

۱۔ جمہورِ امّت اس کا یہ جواب دیتے ہیں:

اس واقعہ کے وقت جنّت کی حیثیت دارالجزاء کے طور پر مُتعیّن نہیں ہُوئی تھی اس لیے ضروری نہیں کہ ابلیس کی آمد و رفت جنّت میں بالکل بند ہو چکی ہو۔ قرآن نے کہیں بھی تو نہیں کہا کہ جب ابلیس راندۂ درگاہ قرار دیا جا چکا تو فرشتوں نے فوراً اُسے اُٹھا کے ملاءِ اعلیٰ سے نیچے پھینک دیا بلکہ اس کے برعکس زمین پر اُترنے کا حُکم اس کے نام بھی اس وقت صادر ہُوا جب ہبُوطِ آدم کا فیصلہ ہُوا۔ کیوں نہ یہ سمجھا جائے کہ ابلیس نے جنّت میں پہنچ کر آدم و حوّا کو ورغلانے کی کوشش کی؟

اگر آپ کو یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ ابلیس جنّت میں آمد و رفت رکھ سکتا تھا تو آدم و حوّا سے اس کی ملاقات کی کئی صُورتیں اور بھی ممکن ہیں

ہو سکتا ہے کہ ان میں سے اس نے کوئی صورت اختیار کر لی ہو۔ آدم و حوّا کو جنّت میں قیام کرنے کا حکم ہوا تو ظاہر ہے کہ اس سے پہلے وہ کسی اور مقام پر ہوں گے۔ وہاں سے منتقل ہوتے ہوئے اثنائے راہ میں بھی آدم و ابلیس کی ملاقات ہو سکتی ہے۔ کیا یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ یہ ساری بات چیت ابلیس نے رستے ہی میں کر لی تھی! اور اگر آپ اس کو بھی خارج از امکان تصوّر فرمائیں تو جنّت کے اندر نہ سہی جنّت کے دروازے پر تو ملاقات کرنے میں کوئی پابندی نہیں تھی۔ آدم اور حوّا بابِ جنّت پر سیر کرتے پہنچے ہوں گے کہ ابلیس کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔ مشہور تابعی حسن کا بھی یہی قول ہے۔

"انہار اھما علی باب الجنۃ لانہما کان یخرجان منہا"[1]

قرآن نے ایک اور جگہ اس واقعہ کو فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ کے الفاظ میں بیان کیا۔ اگر اس ساری روداد کو وسوسۂ شیطانی سے تعبیر کیا جائے تو اس مقصد کے لیے شیطان کی دخولِ جنّت کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ وسوسہ دِل میں جنّت سے باہر رہ کر بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ ایک فاضل کے الفاظ میں "جس طرح ایک آواز ٹیلی فون اور ریڈیو کے ذریعے زیادہ سے زیادہ دُور جا سکتی ہے۔ جس طرح لاسلکی (وائرلیس) میں صرف شعاعوں اور آواز کی لہروں کے ذریعہ سے ایک پیغام ہزاروں میل پر پہنچایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کیوں ممکن نہیں کہ شیطان کا وسوسہ نفسِ انسانی تک اسی طرح پہنچ جائے۔"

2۔ یہ بجا کہ جنت میں ہمیشہ کی زندگی ہوگی۔ اور اس میں داخل ہونے کے بعد پھر اس میں سے کسی کو نہیں نکالا جائے گا۔ مگر آپ بار بار اس بات کو فراموش کیے دیتے ہیں کہ جنّت کی یہ صفت قیامت ظاہر ہونے کے بعد معرضِ عمل میں آئے گی

[1] تفسیر مظہری ج ۱ ص 57

قیامِ قیامت سے قبل اس خصوصیت کا ظہور ضروری نہیں - احادیث میں تقریباً تواتر سے یہ بات نقل ہوئی ہے کہ معراج کی رات حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں بھی تشریف لے گئے اور اس کو ملاحظہ فرمایا۔ پھر اس کے بعد دنیا میں تشریف لے آئے۔

۳۔ جنت میں جھوٹی بات نہ کہہ سکنے اور اس کے دار الجزاء ہونے کی خصوصیات بھی قیامت کے بعد سے متعلق ہیں۔ لازم نہیں کہ قصۂ آدم و ابلیس کے وقت بھی یہ پابندیاں نافذ ہوں۔ مثال کے طور پر قرآنِ حکیم نے متعدد مرتبہ اس کا اعلان کیا ہے (اور عقلِ سلیم بھی اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے) کہ کوئی شخص اللہ تبارک و تعالیٰ کے سامنے جھوٹی بات نہیں کر سکے گا۔ مگر آپ پچھلے صفحات میں پڑھ چکے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے حضرت آدم کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا:

اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ   میں اس سے بہتر ہوں۔

حالانکہ اس کا یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد اور لغو و باطل تھا۔ معلوم ہوا کہ لغو اور باطل بات نہ کہہ سکنے کا اعلان قیامت کے ساتھ خاص ہے۔ ورنہ ابلیس کو یہ ہمت ہرگز نہ ہوتی۔ اسی پر آپ جنت میں ابلیس کی کذب بیانی کو قیاس کر لیجیے۔

اور یہ تو اعتراضات کے جوابات ہیں۔ مزید قوی اور مسکت دلائل جنت کے جنت الماویٰ ہونے کے یہ ہیں۔

سورۂ بقرہ کے آغاز سے لے کر قصۂ آدم و ابلیس تک کی تمام آیات پیشِ نظر رکھیے۔ اس قصہ سے صرف چار آیتیں پہلے قرآنِ حکیم نے مومنین کو بہشت کا مژدہ سنایا ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (بقرہ)

(اور ان لوگوں کو خوشخبری سُنا دیجیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کہ ان کے لیے بہشت کے باغ ہیں کہ ان کے نیچے دریا بہہ رہے ہیں۔)

اس کے بعد یہ واقعہ بیان ہوتا ہے اور اس میں جس جنّت کا ذکر ہے سے ل کے ساتھ معرُوف فرمایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کسی عام باغ کا ذکر نہیں بلکہ اسی معہود و موعُود جنّت کا تذکرہ ہے۔

والالف واللام ليست للعموم ولا للمعهود لفظي وانما لقود على معهود ذهني وهو المستقر الشرعا من جنة الماوى [1]

پھر اس کے متصل ہبوطِ آدم کی داستان بیان ہوتی ہے تو ارشاد ہوتا ہے

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۔

(اب تم سب نیچے اتر جاؤ ایک دُوسرے کے دُشمن ہو کر اور تمھارے لیے زمین ہی پر ٹھکانا اور ایک میعاد تک نفع اُٹھانا ہے۔)

اس سے معلوم ہُوا کہ آدم و حوّا اس سے پہلے زمین کے عِلاوہ کہیں اور مُقیم تھے جہاں سے اُنھیں زمین پر اُترنے کے احکام صادر کیے جا رہے ہیں ورنہ اگر وہ پہلے ہی سے زمین پر مقیم تھے تو ان کے نام اس ارشادِ باری کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ تم سب نیچے زمین پر اُتر جاؤ؟

---

[1] البدایۃ والنہایۃ

عصمتِ انبیاء

اب دوسرے سوال کو لیجئے۔ آپ کہتے ہیں کہ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حضرتِ آدم علیہ السلام سے گناہ سرزد ہوا تھا تو کیا انبیاء علیہم السلام سے بھی معصیت کا صدور ممکن ہے ؟

حضرات انبیاء کے متعلق قرآن و حدیث کی غیر مبہم اور واضح تصریحات جو کچھ بتاتی ہیں وہ یہ ہے کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں اور ان سے کوئی معصیت سرزد نہیں ہوتی۔ اس لیے نہیں کہ وہ مجبورِ محض ہیں اور بدی کے ارتکاب کی قدرت ہی نہیں رکھتے بلکہ اس لیے کہ افعال میں مختار ہونے کے باوجود وہ سیرت و کردار کی عظمت و مرتبت اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی خاص حفاظت کے باعث اس طرح کی ہر آلائش سے پاک و صاف ہیں۔

حضرت شاہ اسمٰعیل شہید لکھتے ہیں۔

"ومعنیٰ عصمت آنست کہ آنچہ بایشاں تعلق می دارد واقوال وافعال وعبادات و عادات ومعاملات ومقامات واخلاق واحوال آں ہمہ را حق جلّ وعلا از مداخلت نفس وشیطان وخطاء ونسیان بقدرت کاملہ خود محفوظ می دارد وملائکہ حافظین را برایشاں می گمارد وتا غبارِ بشریت دامن پاک ایشاں را نہ آلاید (منصبِ امامت ص8)

(عصمتِ انبیاء سے مراد یہ ہے کہ انبیاء کے اقوال وافعال، عبادات و عادات، معاملات ومقامات اور اخلاق واحوال ساری چیزوں کو اللہ تعالیٰ نفسِ امارہ اور شیطان اور خطاء ونسیان سے اپنی قدرتِ کاملہ کے باعث محفوظ رکھتا ہے اور فرشتوں کو ان کی محافظت پر متعین فرماتا ہے تاکہ ان کے

پاک دامن بشریت کے گرد و غبار سے آلودہ نہ ہونے پائیں۔)

اس لیے قرآن حکیم انبیاء کے فرائضِ رسالت کا شمار کرتا ہے تو ان کا ایک فرضِ منصبی تزکیہ بھی بیان کرتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ

(وہی ہے جس نے اُمّیوں میں (وہ عظیم المرتبت) رسول مبعوث فرمایا، جو ان پر اس کی آیات تلاوت کرتا ہے اور انھیں پاک وصاف بناتا ہے۔)

اس آیت کو غور سے پڑھیے۔ اس میں اعلان اس امر کا ہو رہا ہے کہ حضورؐ نہ صرف یہ کہ خود پاک وصاف ہیں بلکہ ان کے فرائضِ منصبی میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ مومنین کی جماعت کا تزکیہ فرمائیں۔ اب اگر کسی کا عقیدہ یہ ہو کہ خود پیغمبر سے بھی معصیت سرزد ہو سکتی ہے تو آپ خود اندازہ فرمائیے کہ اس کے بعد وہ اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونے میں کیسے کامیاب ہو سکے گا؟ کیا اس کے بعد آپ یہ مصرعے پڑھ کر اس کی قیادت سے بے نیاز نہیں ہو جائیں گے کہ ع

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

یا ——— چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن مرحوم و مغفور نے اس سلسلے میں خوب لکھا کہ:

"دنیا کی کوئی گورنمنٹ بھی اگر کسی شخص کو ایک ذمہ داری کے عہدہ پر مامور کرتی ہے تو پہلے دو باتیں سوچ لیتی ہے:

یہ شخص گورنمنٹ کی پالیسی کو سمجھنے اور اپنے فرائض کو انجام دینے کی لیاقت رکھتا ہے یا نہیں۔

گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کرنے اور رعایا کو جادہ وفاداری پر قائم رکھنے

کی کہاں تک اس سے توقع کی جاسکتی ہے؟

کوئی بادشاہت یا پارلیمنٹ ایسے آدمی کو نائبُ السّلطنت یا سفیر مقرر نہیں کرسکتی جس کی نسبت حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے یا اس کی پالیسی اور احکام سے انحراف کرنے کا ادنیٰ شبہ ہو۔ بیشک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی قابلیت یا جذبۂ وفاداری کا اندازہ حکومت صحیح طور پر نہ کرسکی ہو لیکن خداوند قدوس کے متعلق یہ بھی احتمال نہیں۔ اگر کسی فرد کی نسبت اس کو علم ہے کہ یہ میری وفاداری اور اطاعت شعاری سے بال برابر تجاوُز نہ کرے گا تو محال ہے کہ وہ آگے چل کر اس کے خلاف ثابت ہوسکے ورنہ علم الٰہی کا غلط ہونا لازم آتا ہے، العیاذ باللہ ـــــ اور یہیں سے عصمت انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ سمجھ میں آجاتا ہے،، (فوائد موضح الفرقان، ص 77)

اسی لیے جمہورِ امت کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء عقیدہ و عمل کی ہر خرابی سے معصوم و مامون ہیں۔ البتہ افعال و عادات کے شعبہ میں کبھی کبھی منجانب اللہ ان سے کوئی نہ کوئی سہو یا نسیان ہوجاتا ہے مگر اس میں بھی عام افراد کے لیے تعلیم کے مختلف پہلو پنہاں ہوتے ہیں اور ایک لحاظ سے ان کا یہ سہو و نسیان اُمت کے حق میں رحمت سے کم نہیں ہوتا۔ موطا امام مالک میں ہے کہ:

عَنْ ابی ھُریرۃ یقول صلّے رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم صلوۃ العصر فسلّم فی رکعتین فقام ذوالیدین فقال اُقصِرّت الصلوۃ یارسول اللہ ام نسیت فقال رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم کلّ ذٰلک لم یکن فقال قد کان بعضُ ذٰلک یارسول اللہ فَاَقبَلَ رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم علی النّاس فقال اصدق ، ذوالیدین فقالوا نعم فقام رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم فَاَتَمَّ ما بقی من الصّلوۃ ثم سَجَدَ سجدتین بعد التّسلیم وھو جالسٌ (باب ما یفعل من سلّم من

رکعتیں ساھیا۔

(حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھی تو دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا۔ اس پر ذوالیدین کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! کیا نماز کی رکعتوں میں تخفیف ہو گئی ہے یا آپ بھول گئے ہیں۔ حضور نے فرمایا کوئی بات نہیں ہوئی۔ ذوالیدین نے کہا یا رسول اللہ کچھ تو ہوا ہے۔ اس پر حضور لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے پوچھا کہ کیا ذوالیدین سچ کہتا ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں۔ پس رسول اللہ اٹھے اور جس قدر نماز باقی تھی اُسے مکمل کیا۔ پھر سلام کے بعد سجدے کیے اس حالت میں کہ آپ بیٹھے تھے۔)

اسی طرح صحیح بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ حضور نے ایک دفعہ ظہر کی نماز ادا کرتے ہوئے پانچ رکعتیں پڑھیں۔ عرض کیا گیا نماز زیادہ ہو گئی ہے آپ نے پانچ رکعت پڑھ لی۔ اس پر حضور نے ارشاد فرمایا:

انما انا بشرٌ مثلکم انسی کما تنسون فاذا نسیتُ فذکرونی (متفق علیہ)

(میں تمھاری ہی طرح ایک انسان ہوں، بھولتا ہوں جس طرح تم بھول جایا کرتے ہو۔ جب میں بھول جایا کروں تو مجھے یاد کرا دیا کرو)

ان دونوں حدیثوں کے مضمون پر غور کیجیے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ حضور سے سہو ہوا جو ان کی شان کے شایان نظر نہیں آتا۔ لیکن فرض کیجیے اگر آپ کے بعد امت کے لوگوں کو نماز میں سہو پیش آتا جیسا کہ عام طور پر آتا ہے تو کون بتاتا کہ اس کے لیے سجدہ سہو ادا کرو اور اس کا یہ طریقہ ہے۔

اس لیے ہم نے عرض کیا کہ پیغمبر کا سہو بھی منجانب اللہ ہوتا ہے اور اس کے

ذریعے بھی امّت کو کوئی نہ کوئی تعلیم دینا مقصود ہوتا ہے۔ موطا امام مالک کے ایک باب "ما جاء فی لیلۃ القدر" کی ایک حدیث میں تو قریب قریب یہی صراحت موجود ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ اس کے راوی ہیں حضورؐ نے فرمایا:-

وَقَدْ رَأَيْتُ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ ثُمَّ أُنْسِيْتُهَا

(اور میں نے شبِ قدر کو دیکھا تھا۔ پھر میں بھلا دیا گیا۔)

اس حدیث میں "ثُمَّ أُنْسِيْتُهَا" کے الفاظ پر غور کیجیے۔ حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں بھول گیا بلکہ ارشاد یہ فرمایا کہ میں بھلا دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی مصلحتِ خاص کے تحت میرے ذہن سے اس رات کی صحیح تاریخ محو کر دی شارحینِ حدیث لکھتے ہیں کہ اس نسیان میں حکمت یہ تھی کہ لوگ رمضان کے آخری عشرہ میں ہر رات عبادت کریں، برابر اس کے مشتاق رہیں اور یہ خیال کریں کہ اگر کسی شب ہم خواب کی لذت میں گم رہے اور عبادت ہم نے ترک کر دی تو ہو سکتا ہے کہ وہی رات شبِ قدر ہو اور اس طرح ہم اس کے اجرِ عظیم سے محروم رہ جائیں ۔ظاہر بات ہے کہ اگر حضورؐ نہ بھولتے اور متعیّن طور پر شبِ قدر کی نشان دہی کر دیتے تو اہلِ ایمان میں لیلۃ القدر کے علاوہ رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت کرنے کا جذبہ باقی نہ رہتا۔ اسی طرح احادیث میں یہ جو روایت پائی جاتی ہے کہ لیلۃ التعریس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نماز فوت ہوئی تو اس کی بھی یہی حکمت ہے کہ امّت کو اس کے ذریعے قضا نمازوں کی ادائیگی کا مسئلہ معلوم ہو۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جو فعل سرزد ہوا تھا اس کی حیثیت معصیت کی ہے یا سہو و نسیان کی؟ سب سے پہلے یہ جان لیجیے کہ معصیت کا اطلاق صرف اس فعل پر ہوتا ہے جس میں قصد اور ارادہ کا دخل ہو

اگر بھول چوک سے یا سہو و نسیان کے ساتھ کوئی لغزش ہو جائے تو قرآنِ کریم خود کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ

(تم پر بھول چوک میں کوئی گناہ نہیں۔ گناہ اس میں ہے جس کا تمہارے دلوں میں ارادہ پایا جائے۔)

معصیت کی اس تعبیر کو نظر میں رکھتے ہوئے جب ہم قصہ آدم و ابلیس پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم سے اکلِ شجرہ کا جو فعل سرزد ہوا تھا، اس میں ان کے قصد و ارادہ کا ذرہ برابر دخل نہیں تھا۔ وہ نافرمانی کے جذبے سے اس صورتِ حال میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ قرآن خود ان کی صفائی پیش کرتا ہے کہ اس لغزش میں ان کے قصد و ارادہ کا قطعاً دخل نہیں تھا۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا

(اور بے شک ہم نے اس سے پہلے آدم سے ایک عہد لیا تھا۔ وہ اُسے بھول گئے اور اس میں ہم نے اُن کا کوئی ارادہ نہ پایا۔)

بعض لوگ سورۂ طٰہٰ کی ان آیات کو حضرت آدم علیہ السّلام کی معصیت کے لیے بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔

وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ

ان کے نزدیک عصیٰ اور غویٰ کے الفاظ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السّلام نے گناہ کا ارتکاب کیا تھا۔ مگر ہمارے نزدیک ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں۔ معصیت کا ایک مشہور مطلب تو وہی ہے جو عام طور پر مترجمین اختیار کرتے ہیں۔ مگر لغت کی مشہور کتاب لسان العرب کی رُو سے

معصیت کا لفظ کبھی کبھی مجازاً لغزش کے مفہوم میں بھی بولا جاتا ہے۔

المعصية مصدرٌ وقد تطلق على الزلّة مجازا

رہا غوایت کا لفظ تو عام معنی اس کے بھی اگرچہ گمراہی کے ہیں مگر یہ ناکام ہونے کے معنوں میں بھی اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔ امام راغبؒ نے اپنی مشہور کتاب مفردات میں اس مفہوم کی تائید میں ایک شاعر کا یہ مصرعہ نقل کیا ہے۔

وَمن يغو لا يعدم على الغيّ لائما

(ناکام ہونے والے کو ناکامی میں ملامت کرنے والا بھی ضرور ملتا ہے۔)

عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے "حسنات الابرار سیّات المقربین" یعنی وہ کام جو عام نیکوکاروں کے حق میں بطورِ نیکی شمار ہوتے ہیں مقربین کے لیے ان کی حیثیت گناہ کی سی ہوتی ہے۔ وہ خود بھی مراتبِ معرفت میں ترقی کر جانے کے بعد مرتبۂ اولیٰ کو اپنی شان کے منافی سمجھتے ہیں اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہیں۔ حقِ تعالیٰ بھی اس طرح کے امور پر انھیں سختی سے تنبیہ فرماتا ہے۔ مگر حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے خیال کے مطابق یہ بات

خدا اور اس کے انبیاء تک محدود ہے۔ عام لوگوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اُسے قریہ قریہ پھیلائیں حضرت شاہ عبدالعزیز کے الفاظ یہ ہیں:

"بعضے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام را از خدائے تعالیٰ در مقامِ عتاب الفاظ عتاب آمیز وارد شدہ امت را ہرگز جائز نیست کہ بمقتضائے آں الفاظ در حق آنحضرت تکلم نماید مثل عصی آدم ربہ فغوی حالانکہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسّلام را عاصی وغاوی گفتن، کفر است و مثل لا الٰہ الا انت سبحانک انی فالقمہ الحوت وہو ملیم کہ در حق یونس

علیہ السلام آبق وظالم وملیم گفتن ہیچ کس را جائز نیست[1]"

(اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے بعض انبیاء کے بارے میں عتاب کے موقع پر عتاب آمیز الفاظ استعمال کیے گئے جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو عاصی وغاوی کہنا کفر ہے یا مثلاً حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق آیات نازل ہوئیں لیکن (خوب جان لینا چاہیئے کہ) ہم میں سے کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ حضرت یونسؑ کی شان میں آبق وظالم وملیم جیسے الفاظ استعمال کرے۔)

انسان خطاونسیان کا پتلا ہے۔خود فرشتے کہہ چکے تھے کہ یہ زمین میں خون بہاتے گا اور فساد پھیلائے گا، دُنیا کی زندگی میں اس سے گناہ بھی سرزد ہونے تھے اور نیکیاں بھی۔ اللہ تعالیٰ نے جب اس کو ہدایت کا راستہ دکھانے کا ذمہ لیا تو یہ بھی ضروری تھا کہ اُسے گناہ ہوجانے کے بعد ازالۂ معصیت کا طریقہ سمجھایا جائے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس ہوکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناکام ونامراد ہوجائے۔اور یہ راہ ہدایت دکھانے کے لیے چونکہ وہ اپنے انبیاء مبعوث فرماتا ہے اس لیے اس حکمت بالغہ مقتضی ہُوئی کہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السّلام کے ذریعے ان کی اولاد کو توبہ واستغفار کا طریقہ سکھائے لغزشِ آدم اسی کا ایک بہانہ بنی اور انسان نے جان لیا کہ حقِ تعالیٰ سے اپنی غلطی کو مُعاف کرانے کا صحیح راستہ کون سا ہے۔

اور اس تعلیم کا عملی نمُونہ پیش کرنے کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو کیا اعزاز عطا ہوا؟ حدیث شریف میں آتا ہے، حضور نے فرمایا:

مامن داعٍ یدعوا الیٰ ھدیٰ الّا کان لہ مثل راجرِ من

---

[1] فتاویٰ العزیزیہ ص ۱۰۱

اتبعہ لا ینقص ذالک من اجورھم شیًا

(جو شخص ہدایت کی طرف بلائے تو اس کو مثل اس کے ثواب ملے گا جو اس کی پیروی کرے درآنحالیکہ پیروی کرنے والے کا ثواب بھی کچھ کم نہیں ہو گا۔)

حضرت آدم نے سب سے پہلے توبہ کی سُنت جاری کی۔ اس حدیث کی رُو سے ان کے بعد جب بھی کبھی کوئی توبہ کرنے والا توبہ کرے گا حضرت آدم علیہ السّلام اس کے ثواب میں شریک ہوں گے۔ کون ہے جو حضرت آدم علیہ السّلام کے وقت سے لے کر قیامت تک کے توّابین کی فہرست مرتب کر سکے؟ کس کے بس میں ہے کہ اس ثواب کا اندازہ کر سکے جو اس سُنّت کے اجراء کی وجہ سے اب تک حضرت آدم کے حساب میں لکھا جا رہا ہے اور قیامت تک لکھا جاتا رہے گا اور کس میں ہمت ہے کہ اس لغزش کو گناہ کہہ سکے جو اس طرح حضرت آدمؑ کے رفعِ درجات کا باعث بنی۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے عارفین نے ہبوطِ آدم کو بھی بمنزلہ سزا قرار نہیں دیا بلکہ ہمیشہ اسے انعامِ خداوندی سے تعبیر کیا ہے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی رح فرماتے ہیں:

"حضرت آدم علیہ السّلام کو حق تعالیٰ کی معرفت جنّت میں بھی تو حاصل تھی مگر ایسی کامل نہ تھی جو دنیا میں آکر کامل ہوتی۔ کیونکہ پہلے وہ حق تعالیٰ کی صفاتِ منعم، معطی محسن و امثالہا کو تو عین الیقین سے جانتے تھے کہ ان صفات کے آثار ان پر وارد تھے۔ مگر صفاتِ غفور و منتقم و توّاب کو صرف علم الیقین کے درجے میں جانتے ہوتے تھے۔ عین الیقین کے درجے میں ان کا پورا انکشاف نہ ہوا تھا۔ اکلِ شجرہ و خروج عن الجنّۃ" سے ان صفات کا کامل مشاہدہ ہو گیا کما قیل۔

گناہِ من از نامدے در شمار
ترا نام کے بُودے آمرزگار

یعنی کے ظہور او بودے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ جنت سے آدم علیہ السلام ہی کا اترنا اس لیئے اچّھا ہوا کہ ان کا کچھ نقصان نہیں ہوا۔ اور ہمارا فائدہ ہوگیا۔

امام ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کیا لطیف بات ارشاد فرمائی:

یاآدم لا تجزع من قولی لک واخرج منها فلك خلقتها ولکن اهبط الی دار المجاهدو وابذر بذر التقویٰ وامطر علیه سحائب الجفون فاذا اشتد الحب واستغلظ واستویٰ علیٰ سوقه فتحال فاحصده یا آدم ما اهبتك من الجنة الا التوسل الی فی الصعود و ما اخرجتک منها نفیالك عنها ما اخرجتك عنها الا التعود

(مدارج السالکین ج ۱ ص ۱۶۶)

(اے آدم میرے اس حُکم پر پریشانِ خاطری میں مبتلا نہ ہونا جس کی رُو سے میں نے تجھے جنّت سے نکلنے کے لیے کہا ہے۔ اس لیے کہ جنّت تو میں نے پیدا ہی تیرے لیے کی ہے۔ لیکن اس وقت زمین پر اُتر جاؤ جو تمھارے لیے دار المجاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زمین میں تقویٰ کی تخم ریزی کرو۔ اشکبار آنکھ سے اس کو پانی دو۔ جب یہ بیج مضبوط ہو جائے اور تنا ور بن کر بلند ہو جائے (یعنی جب یہ فصل پک چکے) تو اسے کاٹ لو۔ اے آدم! میں نے تجھے جنّت سے نہیں اُتارا۔ مگر اس لیے کہ یہ تیرے لیے مزید رفع درجات کا وسیلہ بن جائے اور جنّت سے نہیں اتارا مگر اس لیے کہ تُو اس میں دوبارہ پلٹ کر آئے۔)

توبۂ آدم

ہر چند کہ حضرت آدم علیہ السلام سے کسی گناہ کا صدور نہیں ہوا تھا مگر کمالِ عبودیت کے باعث ان پر اتنی سی بات بھی بہت گراں ہوئی اور وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ و زاری کرنے لگے۔ یہاں تک کہ رحمتِ حق میں جوش میں آئی اور توبہ کے کلمات خود بارگاہِ صمدیت سے حضرت آدم کو تلقین ہوئے " رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ "

اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ آدم ہمارے منتخب اور برگزیدہ بندے ہیں۔

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَ هَدٰى۔

(پھر اُن کے پروردگار نے اُن کو مجتبیٰ بنا دیا، ان پر توجہ فرمائی اور اُن کی راہنمائی کی)

بعض لوگ حضرت آدم کی توبہ سے بھی غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں مگر جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں یہ ان کے کمالِ عبودیت کا نتیجہ ہے۔ اُن کی توبہ کے ذریعے اولادِ آدم کو یہ سبق دیا جا رہا تھا کہ دیکھو جب ترکِ اولیٰ پر ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام جیسے پاک نفس اللہ کے حضور گریہ و زاری کر رہے ہیں تو تمہیں اپنی خطاؤں پر اس سے بھی زیادہ شدّتِ احساس کے ساتھ اللہ سے مغفرت طلب کرنی چاہیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعتِ شان کا تصوّر کیجیے اور پھر ان حدیثوں کا مطالعہ کیجیے جو حضورؐ کی شانِ استغفار میں وارد ہیں آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہاں جو جتنا سر بلند ہے اتنا ہی خدا کے حضور سر افگندہ نظر آتا ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں۔

وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَ اَتُوْبُ اِلَیْهِ فِی الْیَوْمِ اَكْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً (بخاری)

(خدا کی قسم میں اللہ کے حضور ایک دن میں ستر ستر مرتبہ سے بھی زیادہ استغفار کرتا ہوں۔)

اور یہ توبہ کس لیے ہوتی ہے۔ اِس لیے نہیں کہ حضور سے العیاذ باللہ کوئی معصیت سرزد ہو جاتی ہوگی۔ صرف اس لیے کہ حضور اللہ تعالیٰ کی یاد سے ایک لمحہ غافل ہونا بھی اپنے لیے قابلِ استغفار سمجھتے تھے۔ خود ارشاد فرمایا کہ۔

وَاِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِىْ وَاِنِّىْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِى الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ (مسلم)

(میرے دل پر ایک بادل سا چھا جاتا ہے اور میں بھی اللہ تعالیٰ سے ایک ایک دن میں سو سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں)

کون کہہ سکتا ہے کہ دل پہ بادل سا چھانا شریعت الٰہی میں کوئی قابلِ مواخذہ جُرم ہے۔ انسان کے عالمِ نفسیات میں ہر آن تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ جہانِ قلب کی حالت ہر لحظہ دگرگوں ہوتی ہی رہتی ہے اور اس سمندر میں توجہ و التفات اور بسط و قبض کا مدو جزر آئے دن کی بات ہے اس لیے شریعت نے وسوسوں اور خیالوں پر دنیا و آخرت دونوں میں کوئی سزا مقرر نہیں کی مگر اللہ کے پیغمبر کا مقامِ بلند کہ وہ ہر اس سانس کو گناہ سے آلودہ تصور فرماتا ہے جو اللہ کی یاد میں نہیں آتا۔ میرا اپنا ایک شعر ہے ؎ ہر وہ لمحہ ہے مرا کفر میں شامل اے دوست

دل تری یاد سے جس میں ہُوا غافل اے دوست

مُسلم کی ایک روایت ہے، آپؐ نے فرمایا:

يَاَيُّهَا النَّاسُ تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ فَاِنِّىْ اَتُوْبُ اِلَيْهِ فِى الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ

اے لوگو اللہ کے حضور توبہ کرو کیونکہ میں بھی اُس کے آگے ایک ایک دن میں سو سو مرتبہ توبہ کرتا ہُوں۔

ان تصریحات کے بعد یہ شبہ نہیں رہنا چاہیے کہ حضرت آدم کی توبہ کسی

معصیت و نافرمانی کی بناء پر تھی ـــــ اُن کی توبہ ایک دلِ دردمند کی شدتِ احساس کا مظہر تھی اور اُن کی اولاد کے لیے ایک زبردست سامانِ تعلیم۔

ہبوطِ ارضی کا فرمان

حضرتِ آدم کے زمین پہ اُترنے اور جنت سے نکلنے کو عام طور پر کم سواد و کم نظر لوگ سزا و عتاب ہی کی ایک شکل قرار دیتے ہیں۔ حضراتِ شعراء نے خاص طور پر اس نظریہ کی اشاعت فرمائی ہے کہ اگر حضرت آدم دانۂ گندم نہ کھاتے تو آج اُن کی ذُرّیت اس ظلمت کدۂ عالم میں ٹھوکریں نہ کھاتی پھرتی مگر قرآنِ حکیم اس باطل عقیدہ کی پُرزور تردید کرتا ہے۔ اس اعلان کے بعد کہ۔

فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔

اللہ تعالیٰ نے آدم کی توبہ قبول کرلی اور وہ تو ہے ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان۔

ارشاد ہوا۔

اِهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔

(تم سب اِس سے نیچے اُتر جاؤ پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو اُن کے لیے نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔)

اس سے پہلے بھی اِهْبِطُوا کا ایک حکم مذکور ہو چکا تھا مگر قبولِ توبہ کے بعد پھر اس کی تکرار فرمائی تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ ہبوطِ ارضی آدم کی کسی خطا و معصیّت کا نتیجہ تھا اگر اکلِ شجرہ کا فعل کوئی خطا بھی تھا تو قبولِ توبہ کے بعد اس پر سزا دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ حکم اگر حکمِ عتاب تھا تو لغزش کے معاف فرما دیے جانے پر اسے منسوخ ہو جانا چاہیئے تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اِس کے باوجود

دربارِ الٰہی سے اھبطوا کے احکام صادر ہوتے ہیں۔ یہ احکام دراصل اِسی لیے مکرر ارشاد ہوئے تاکہ یہ ثابت ہوجائے کہ جنّت سے آدم کا اخراج سزا پر مبنی نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی اپنی خاص مصلحتوں اور حکمتوں کا نتیجہ ہے۔ لوگ زمین پہ اتارے جانے کو سزا سے تعبیر کرتے وقت نجانے یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ آدم تو پیدا ہی خلافتِ ارضی کے لیے ہوئے تھے۔ وہ درخت کا پھل کھاتے یا نہ کھاتے آخر کار ایک نہ ایک دن انہیں زمین پہ نزولِ اجلال فرمانا ہی پڑتا! اِسی لیے مشہور صوفی بزرگ حضرت ابن عربی کا قول ہے کہ "اُتر جانے کے اس حکم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے درجے اور مرتبے سے آدم علیہ السلام کو محروم کر کے تنزل کی سزا دی گئی بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی سے زیادہ اھبطوا کا مفاد کچھ اور نہیں نکلتا" فھو ھبوط مکان لا ھبوط رتبۃ

ہبوطِ ارض کے اس فرمان میں ایک پہلو اور بھی خاص طور پہ قابلِ غور ہے۔ اس حکم کے مخاطب اگر صرف آدم و حوّا ہوتے تو تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا جاتا، جمع کا صیغہ لانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر آدم و ابلیس و حوّا سے یہ خطاب تھا تو معنوی طور پہ اس تفسیر میں کئی اسقام ہیں۔ حضرت آدم اللہ کے پیغمبر ہیں ان سے یہ اندازِ تخاطب کہ اگر آپ میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو آپ کو کوئی خوف اور حزن لاحق نہیں ہوگا کوئی معنی نہیں رکھتا اس لیے کہ وہ تو ابدالآباد تک مجتبےٰ و مصطفےٰ ہو چکے۔ اُن کے اس مقام پہ اب کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ رہا ابلیس تو وہ بھی ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ قرار دے دیا گیا۔ اب اس سے یہ توقع ہی خارج از بحث ہے کہ وہ کبھی اس آیت کا مورد و مصداق بن سکے۔ پھر روئے سخن ہے کس کی طرف؟ محققین کی رائے یہ ہے کہ اگرچہ یہاں خطاب بظاہر آدم و حوّا سے ہے لیکن چونکہ "اُن کی پشت اُن کی اولاد کے لیے بمنزلہ سفینہ تھی"

اس لیے مقصود خطاب یہاں اولادِ آدم ہے۔ کہا ان کو جا رہا ہے کہ اگر تم ہماری ہدایت کی پیروی کرو گے تو پھر سے یہ جنت تمہیں عطا کر دی جائے گی اور اگر اس سے اعراض برتو گے تو تمہیں جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ،

کتبِ حوالہ

اس کتاب کی ترتیب میں مؤلف نے جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے یا جن کے حوالے مضمون میں آئے، ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

تفسیر الطبری جلد اول (ابن جریرؒ)

تفسیر ابن کثیرؒ (ابنِ کثیرؒ)

تفسیر کبیر (امام رازیؒ)

تفسیر القیم (امام ابنِ قیمؒ)

تفسیر قاضی البیضاوی (الجزء الاول)

البحر المحیط (لابن حیان اندلسیؒ)

تفسیر المظہری (مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ)

تفسیر بیان القرآن (مولانا تھانویؒ)

تفسیر ماجدی جلد دوم (انگریزی) مولانا عبدالماجد دریابادی)

بیان القرآن جلد سوم (مولوی محمد علی لاہوری)

تفسیر احمدی (سرسید احمد خاں مرحوم)

تفسیر المنار (مفتی محمد عبدہٗ)

فوائد موضح القرآن (شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم)

معارف القرآن (مولانا محمد ادریس کاندھلوی)

کتاب مقدس

البدایہ والنہایہ جلداول (ابن کثیرؒ)

مشکوٰۃ شریف

فیض الباری علی صحیح البخاری (علامہ انورشاہ کشمیریؒ)

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ (شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ)

مؤطا (امام مالکؒ)

الاحکام السلطانیہ (ماوردیؒ)

النبوات (امام ابنِ تیمیہؒ)

الرد علی المنطقیین (امام ابنِ تیمیہؒ)

مدارج السالکین (حصہ اوّل) امام ابنِ قیمؒ)

فتاوی العزیزیہ (حضرت شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی)

تاریخ ابن خلدون (جلداول)

منصب امامت (شاہ اسمٰعیل شہیدؒ)

التنبیہ الطربی فی تنزیہہ ابن العربی (مولانا تھانوی مرحوم)

کتاب الکامل (للمبرد)

مثنوی مولانا روم (جلد چہارم)

مثنوی اسرار و رموز (اقبالؒ)

مقدمہ العلم والعلماء (علامہ ابن عبدالبر ترجمہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی)

تفہیمات جلد دوم (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

ترجمان السنۃ جلد دوم سوم (مولانا بدر عالم میرٹھی)

تحقیق الجہاد (مولوی چراغ علی مرحوم)

سیرِ روحانی (جلداول) میرزا بشیرالدین محمود

ابلیس و آدم (غلام احمد پرویز)

وہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۴ء کو پیدا ہُوئے۔ ابھی ان کی عُمر ۳۸ سال ہے مگر اڑتیس سال کی اس عُمر میں انھوں نے صدیوں پر مُحیط طویل مُسافتیں بھی طے کر لی ہیں اور ایک لمبی جدّوجہد کے ماحصل کو بھی سینے سے لگا لیا ہے۔

وہ ابھی نوعُمر طالب علم تھے کہ انھیں زندگی کی سخت ترین اُلجھنوں اور کشاکشوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ مگر وہ اپنے راستے کی مُشکلات پر ہمیشہ ہنسے۔ انھوں نے اندھیروں کو آنے والی روشنی کے تصوّر سے ہمیشہ خوش آمدید کہا۔

ان کا یہ ثبات اور اپنے اُوپر بھروسہ، ہمیشہ ان کے کام آیا۔ اور جب تعلیم سے فراغت کے بعد عملی زندگی اور عوامی جدّوجہد میں شامل ہُوئے تو یہاں بھی انھیں میرِ کارواں کے کندھے سے کندھا ملا کر آگے بڑھنے کا شرف نصیب ہُوا۔

وہ عوام میں سے اُوپر کو اُٹھے ہیں اور آج جبکہ وہ عوامی حکومت کے ایک ذمّہ دار اور پُروقار وزیر ہیں، ہر لحظہ انھیں یہ بات یاد رہتی ہے۔

۱۹۷۰ء کے عوامی اِنتخابات میں جبکہ سیالکوٹ کے ستانوے ہزار لوگوں نے انھیں قومی اسمبلی کے لیے اپنا نمایندہ چنا تھا، تو انھیں ۵۱-۵۲ء کی وہ ساری تنہائیاں اچھّی طرح یاد تھیں جو لاہور کے بھرے بازاروں اور گنجان محلّوں نے ان کی جھولی میں اس وقت ڈالی تھیں جبکہ وہ نئے نئے اس شہر میں آئے تھے۔

وہ پنجاب کے پہلے اخبار نویس ہیں جنھوں نے "شہاب" کے ذریعے پنجاب کے ہفتہ وار اخبارات کی تاریخ میں کثرتِ اشاعت کے جو ریکارڈ قائم کیے تھے اسے آج تک کوئی توڑ نہیں سکا ہے۔

وہ پنجاب کے وہ شُعلہ بیان خطیب ہیں جن کی زبان بھی شُعلے اُگلتی رہی ہے اور قلم بھی روشنیاں بکھیرتا رہا ہے۔

وہ پہلے بھی مُجاہد تھے اور آج بھی مُجاہد ہیں۔ جہاد ہی ان کی زندگی کا نُقطۂ سفر تھا اور جہاد ہی ان کا مُنتہا اور منزلِ مقصُود ہے۔

ایمان افروز کتابیں

مولینا کوثر نیازی کے قلم سے

اسلام ہمارا دین

یہ تصنیف مولینا کوثر نیازی کے اُن قلبی احساسات وجذبات کی ترجمان ہے جو مولینا کے دِل میں اسلام کی ہمہ گیری وجہانداری کے باب میں اُس وقت سے پرورش پاتے رہے ہیں جب کہ ابھی وہ طالب علم تھے۔

سائز $\frac{18 \times 23}{8}$ ـــــ صفحات 362 ـــــ قیمت 14.50

بصیرت

مولینا کوثر نیازی نے اپنی اِس تالیف میں کلام اللہ کی ایسی آیات کا اِنتخاب کیا ہے جو ہماری روزمرہ زندگی سے براہِ راست رابطہ رکھتی ہیں۔ آپ نے کوزے میں دریا بند کرنے کا اسلوب اپنایا ہے اور ان آیات کی تشریحیں ایک ایک دو دو صفحوں میں سمیٹ لی ہیں جنھیں بیان کرنے کے لیے مفسّرین نے اجزا کے اجزا لکھ ڈالے اور بات پھر بھی تشنہ رہی۔ سائز $\frac{18 \times 23}{8}$ ـــــ صفحات 250 ـــــ قیمت 10.50

بُنیادی حقیقتیں

مولینا کوثر نیازی اِسلام کے سچّے اور مخلص مُبلّغ ہیں۔ یہ کتاب لکھ کر انھوں نے اِسلام کی تبلیغ کا حق پوری طرح ادا کر دیا ہے اور اِسلام کے بُنیادی حقائق عوام کے سامنے مختصر الفاظ میں اس طرح پیش کیے ہیں کہ کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ سائز $\frac{18 \times 23}{8}$ ـــــ صفحات 150 ـــــ قیمت 6.50

آئینۂ تثلیث

مولینا کوثر نیازی نے اپنی اِس تصنیف میں عیسائیت کے اصل حقائق کے چہرے سے نقاب ہٹا کر اُن عیسائی مشنریوں کو آئینہ دکھایا ہے، جو آدمیّت کی نجات کے بہانے بھولے بھالے لوگوں کو گمراہی کے گڑھوں میں دھکیلتے ہیں۔ اور ایسے عقائد کا پرچار کرتے ہیں جن کا حضرتِ مسیحؑ کی تعلیمات سے دُور کا بھی تعلّق نہیں 6.25

تخلیقِ آدم

مولانا نے اپنی اس کتاب میں اِرتقاءِ اِنسانی کے بارے میں ڈارون اور وئیس جیسے فلسفیوں کے افکار و نظریات کا ابطال قرآن وحدیث کی روشنی میں کیا ہے۔ نہایت معلومات افزا کتاب ہے۔ سائز $\frac{18 \times 23}{8}$ صفحات 130 قیمت 6.25

زرِ گل

مولانا ایک اچھے ادیب اور صحافی ہی نہیں، نُغز گو شاعر بھی ہیں۔ زرِ گل ان کی غزلیات و منظومات کا دِل نواز مجمُوعہ ہے۔ صفحات 176 قیمت 10.00

فیروز سنز لمیٹڈ لاہور